اُستاد شاعروں کا کلام

مرتّبہ: پرکاش پنڈت

USTAD SHAIRON KA KALAM

POETRY

Edited by

PRAKASH PANDIT

قیمت دو روپے

فہرس

شعرا — جن کا مکمل تعارف اور تصاویر دستیاب ہیں۔ ۷ تا ۷۵

آتش، آصف، امیر مینائی، انشا۔ جلال، داغ، درد، ذوق، سودا، ظفر، غالب، مجروح، مصحفی، مومن، میر، ناسخ، نسیم، نظیر، ولی۔

شعرا — جن کا صرف تعارف دستیاب ہے۔ ۷۶ تا ۱۴۴

آبرو، آرزو، آزردہ، آشفتہ، آثر، اختر، اسیر، افسوس، امانت، انجام، انیس، بحر، برق، بیاں، بیدار، تاباں، تسکین، تسلیم، تشنہ، تعشق، جرأت، جوش، جوشش، حاتم، حسرت، حسن، ذکی محمد ذکریا، ذکی مہدی علی، راسخ، رند، رنگین، سالک، سراج، سوز، شہیدی، شیفتہ، صابر، صبا، صنعت، ضیا، ظہیر، عزیز، عیش، فائز، فغاں، قائم، گویا، مظہر، ممنون، منیر، نسیم، نقیر، نظام، وحید، وزیر، ہدایت، یقین۔

شعرا — جن کا نہ مکمل تعارف دستیاب ہے نہ تصاویر۔ ۱۴۵ تا ۱۶۷

آباد، احسان، امین، انور، بقا، بیتاب، جواں، جوہر جواہر سنگھ، جوہر مادھو رام، حاتم، حاذق، حزیں، حسرت، حسن، حیا، حیدر، خلیل، داؤد، دیوانہ، راقم، سحر آمان علی، سحر نواب علی، سفیر، شاعر، شرف، طالب، طاہر، غافل، فراق، فیض، مائل، مجذوب، محسن،

محشر، محنت، مسرور، منتہی، موزوں، نشاط، نصرت، واسطی، واصف،
واثق، وفا، ہوش، یکرنگ۔

شاعرات

اختر، بیگم، حجاب، شوخ، ضیا جہاں بیگم، ضیا ضیائی بیگم،
مخفی، یاسمن۔

اُردو کے انگریز شعرا جن کی تصاویر بھی دستیاب ہیں۔

ہیڈرسلی آزاد، فانتم شائق، گارڈنر شکر، برنس شوہر، تھامس طوماس،
جوزف عاشق، ڈی کاسٹا، مانٹروز مضطر، جوزف بروم[illegible]یم۔

تخلص : آتش

نام : خواجہ حیدر علی

پیدائش : ۱۷۷۸ء (فیض آباد)

وفات : ۱۸۴۶ء (لکھنؤ)

تڑپتے ہیں نہ روتے ہیں، نہ ہم فریاد کرتے ہیں
صنم کی یاد میں ہر دم خدا کو یاد کرتے ہیں

انھیں کے عشق میں ہم نالہ و فریاد کرتے ہیں
الٰہی دیکھیے کس دن ہمیں وہ یاد کرتے ہیں

شبِ فرقت میں کیا کیا سانپ لہراتے ہیں سینے پر
تمہاری کاکلِ پیچاں کو جب ہم یاد کرتے ہیں

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گِلہ جاتا رہا

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب بس ہو چکی نماز مصلّے اٹھائیے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ ہوتا ہے

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

شورشِ عشق میں یہ دل ہے قائم آتش
پانی ہو ہو کے بہا کرتا جو پتھر ہوتا

آئینہ دیکھنے کا گزرتا نہیں خیال
اپنی خبر نہیں انھیں، میری خبر کہاں

حالِ دل ہوتے ہیں حسرت کی نگاہوں سے عیاں
میری اس کی گفتگو میں اب زباں خاموش ہے

تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈیئے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے

کر کے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل
بند آنکھیں ہو گئیں، آئینہ حیراں رہ گیا

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ، بچاؤں کدھر کی چوٹ

پاسِ رسوائی کا دونوں جانبوں سے شرط ہے
بس تمہیں، تم مجھ کو سمجھاؤ خدا کے واسطے

آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے

نکل اے جان تن سے تا وصالِ یار حاصل ہو
چمن کی سیر ہے انجام، بلبل کی رہائی کا

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو وہ احساں ہوتا

ہجر کی شب ہو چکی روزِ قیامت سے دراز
دوش سے نیچے نہیں اُترے ابھی گیسوئے دوست

نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آ رہی
دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہیئے

قبر میں روزن مری رکھنا ضرور
مر گیا ہوں انتظارِ یار میں

تخلص : **آصفؔ**

نام : **نواب آصف الدولہ**

پیدائش : ۱۷۴۵ء

دورِ حکومت : ۱۷۷۲ء سے ۱۷۹۷ء (لکھنؤ)

وفات : ۱۷۹۷ء (لکھنؤ)

یہ نہ آنے کے بہانے ہیں سبھی ورنہ میاں
اتنا تو گھر سے مرے کچھ نہیں گھر دُور ترا

کوچے سے اپنے تُو نے مجھ کو عبث اُٹھایا
سب تو چلے گئے تھے اِک میں ہی رہ گیا تھا

جاں نکل جائے گی ظالم! مری اب جانے سے
یاں نہ آنا ہی بھلا تھا ترا اِس آنے میں

قصّۂ فرہاد و مجنوں رات دن پڑھتے ہیں ہم
سو تو وہ ماضی پڑا، اب اپنا افسانہ ہوا

قاصد! تو لئے جاتا ہے پیغام ہمارا
پر، ڈرتے ہوئے لیجیو واں نام ہمارا

تخلص : اختر
نام : نواب واجد علی شاہ
پیدائش : ۱۸۲۸ء (لکھنؤ)
وفات : ۱۸۸۷ء (کلکتہ)

کمر دھوکا، دہن عقدہ، غزال آنکھیں، پری چہرہ
شکم ہیرا، بدن خوشبو، جبیں دریا، زباں عیسیٰ
برائے سیر مجھ سا رند مے خانے میں گر آئے
گرے ساغر، لُنڈھے شیشہ، ہنسے ساقی، بہے دریا

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا، سو ہوا
وحشتِ دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
یا خدا دَیر میں ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
کافرِ عشق مسلماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

درودیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

تخلص : **امیر مینائی**

نام : **امیر احمد**

پیدائش : ۱۸۲۸ء (لکھنؤ)

وفات : ۱۹۰۰ء (حیدرآباد)

اچھے عیسے ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے
تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے
دیکھ لے بلبل و پروانہ کی بے تابی کو
ہجر اچھا نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے
آگیا اس کا تصور تو پکارا یہ شوق
دل میں جم جائے الٰہی یہ خیال اچھا ہے

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے کیسی اِس بھری محفل میں رُسوائی ہوئی
آئینے میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آج دیکھا چاہیئے کس کس کی ہے آئی ہوئی

کیفِ مستی میں بھی رہتا ہے یہ جوبن کا لحاظ
اُن کو انگڑائی بھی آتی ہے تو شرمائی ہوئی
وصل میں خالی ہوئی اغیار سے محفل تو کیا
شرم بھی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی
میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے
جان کی دشمن، یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی
گرد اُڑی عاشق کی تربت سے تو جھنجھلا کر کہا
واہ سر چڑھنے لگی، پاؤں کی ٹھکرائی ہوئی

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار — سادگی گہنا ہے اِس سِن کیلئے
ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا — میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے
وصل کا دن اور اتنا مختصر — دن گِنے جاتے تھے اِس دن کے لئے

اُلفت میں برابر ہے، وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذّت ہے، اگر دل میں مزا ہو
آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے
اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ — ہم کو غصّے پہ پیار آتا ہے

خدا کی شان! جو شوخی سے آشنا ہی نہ تھی
ترس رہی ہے وہی آنکھ اب حیا کے لئے

تسلّی خاک ہو وعدوں سے ان کے چتونیں اُن کی
اشاروں سے یہ کہتی ہیں کہ دیکھو یوں مُکرتے ہیں

جب کہا اس سے شبِ غم کوئی غمخوار نہ تھا
درد نے اٹھ کر کہا "کیا یہ گنہگار نہ تھا؟"

صورت تری دکھا کے کہوں گا میں روزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ، نہ دل کا قصور تھا

آگ جو دل میں لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی
اور کیا تجھ سے بھلا اے دیدۂ گریاں ہو گا

وہ اور وعدہ وصل کا، قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں

دیکھ اے درد جدا ہو نہ دلِ محزوں سے اور اُلجھے گا یہ بیمار جو تنہا ہو گا

ہاتھ رکھ کر مرے سینے پہ جگر تھام لیا تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

نہ کر لے یاس، یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اِسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دیکھ کر آئینہ کو، عکس سے، کہتا ہے وہ شوخ
کچھ اگر حُسن کا دعوے ہے تو باہر آؤ

کِس تُلطف سے جھنجھلا کے وہ کہتے ہیں شبِ وصل
ظالم تری آنکھوں سے گئی نیند کہاں آج

مسجد میں بُلاتے ہیں ہمیں زاہدِ نافہم — ہوتا جو اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے

جو مے فروش سے سودا بنے تو کر لینا — کمی ہو حضرتِ واعظ تو ہم سے بھر لینا

شکوہ تو شوق سے کر وصل میں لیکن اے دل
بات کچھ ایسی نہ بگڑے کہ بنا بھی نہ سکوں

وصل میں چھیڑ کا شکوہ نہ زباں پر لانا
چوم لے گی ترے ہونٹوں کو شکایت تیری

میں مٹ گیا تو وہ بھی مرے ساتھ مٹ گیا
سائے سے خوب حقِ رفاقت ادا ہوا

جب تک ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال — اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

پرزے ترے خط کے ہیں دستِ قاصد میں — ایک کیا سو جواب لایا ہے

ہنس پڑے آپ تو بجلی چمکی — بال کھولے تو گھٹا لوٹ گئی

میرا خط اُس نے پڑھا، پڑھ کے نامہ بر سے کہا
یہی جواب ہے اس کا کہ کچھ جواب نہیں

ہے وہی دوست، جسے جس سے محبت ہو جائے
نہ یہ اپنے پہ ہے موقوف، نہ بیگانے پر

امیر جاتی جوانی یہ مجھ سے کہتی ہے
خزاں نہ مجھ کو سمجھ آخری بہار ہوں میں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ — اے اسیرانِ قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں

اے دلِ صد چاک شانہ بن کے جا پر یاد رکھ
ہے مزاج اُلٹا اُلجھ پڑتی ہے سُلجھانے سے زلف

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

کمبخت پاؤں بھی نہیں تھکتے ملال کے
میرے تمہارے بیچ میں آتا ہے بار بار
پھینکو بھی اب غبار کو دل سے نکال کے
مٹی جو دینے آئے ہو تو وہ ہنسی خوشی

لپٹا میں بوسہ لے کے تو بولے کہ "دیکھئے
یہ دوسری خطا ہے وہ پہلا قصور تھا"

ملا کر خاک میں بھی ہائے بشرم اُن کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کئے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

قریب ہے یار روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کب تک
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

دل سے جلتی ہوئی آنکھوں نے جو مانگا پانی
ضبطِ الفت نے کہا قید ہیں آنسو دل میں

نہ نکلے گا دل کوچۂ زلف سے
مسافر کو رستہ بتائے گی رات

شیخ کعبے سے گیا اس تک برہمن دیر سے
ایک تھی دونوں کی منزل پھیر تھا کچھ راہ کا

الٰہی کیا قیامت ہے وہ جب لیتے ہیں انگڑائی
مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

یوں بیٹھے بیٹھے زیست کے دن ہو گئے تمام
دریا میں جیسے ساکن کشتی رواں رہے

تخلص : اِنشاؔ

نام : سید انشاء اللہ خاں

پیدائش : ۱۷۵۶ء یا ۱۷۵۸ء (مرشد آباد)

وفات : ۱۸۱۷ء یا ۱۸۱۸ء (لکھنؤ)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خیال اُن کا پرے ہے عرشِ اعظم سے کہیں ساقی
غرض کچھ اور دُھن میں اِس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا		لگا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا
نزاکت اُس گلِ رعنا کی دیکھیو انشا		نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

راتوں کو نہ نکلا کرو نہ دروازے سے باہر
شوخی میں دھرو پاؤں نہ انداز سے باہر

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

جھڑکی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی
یہ سب سہی، پر ایک 'نہیں'، کی نہیں سہی
گر 'نازنیں'، کہنے سے بُرا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

لے کے اوڑھوں، بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی پھیکی، سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی

کل وہ بولا مجھ سے ہنس کر 'چاہ! ارے کچھ کھیل نہیں
میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں
حسرت و حرماں یاس و تمنا، دردِ فراق و رنج و تعب
اپنے سر پر اتنی بلائیں ناحق اے دل جھیل نہیں

تخلص : **جلالؔ**

نام : **سیّد ضامن علی**

پیدائش : ۱۸۳۴ء (لکھنؤ)

وفات : ۱۹۰۹ء (لکھنؤ)

اس سے کچھ ذکر مرا بھی دلِ ناشاد رہے
وقت پر بھول نہ جانا یہ تجھے یاد رہے

کسی بے درد کو میں حال سُنا لوں اپنا
نالہ خاموش رہے، چپ ابھی فریاد رہے

رُوح جنّت میں نہ دل ہم میں، نہ ہم مدفن میں
تیرے آوارہ پسِ مرگ بھی آباد رہے

اب کسی سے یہ کہیں کہ ہمیں رنج ہی دے
شاد ہونے کی تمنّا میں تو ناشاد رہے

خیر، بھولے تمہیں وہ تیری وفاؤں کو جلالؔ
یہ غنیمت ہے کہ جَور اپنے انھیں یاد رہے

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زُلفِ یار کی بُو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ مِلا

کہہ کے وہ اٹھ گئے کہ مشکل ہے　　سہل کرنا تمہاری مشکل کا

نجات ہو گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے　　اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لئے

کہہ رہی ہے کہ ضرور آئے گا بے درد کوئی　　یہ ترقی تری اے دردِ جگر آج کی رات

تمہاری مہربانی غیر ہی کو بس مبارک ہو　　ہمیں تو اک نظر بس دیکھ لو نا مہرباں ہو کر

بچتنے آیا جو تم سے آئینہ، آنے بھی دو
خیر، تم اپنی طرف دیکھو، چلو، جانے بھی دو

ایک سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق میں
فرق بس اتنا ہے وہ آنکھوں میں ہے یہ دل میں ہے

تغافل کے گلے سن کر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا

اے اشکِ حسرت جو گر پڑا ہے تمہارے آگے ابھی ٹپک کر
اسی نے آنکھوں میں صبح کی ہے ہزاروں راتیں کھٹک کھٹک کر

شب کو مے خوب سی پی، صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

تخلص: داغ

نام: نواب مرزا خاں

پیدائش: ۱۸۳۱ء (دہلی)

وفات: ۱۹۰۵ء (حیدرآباد)

الٰہی کیا کریں ضبطِ محبّت، ہم تو مرتے ہیں
کہ نالے تیر بن بن کر کلیجے میں اُترتے ہیں
جفا پر جان دیتے ہیں، ستم پر تیرے مرتے ہیں
یہ ناکامِ محبّت، سچ تو یہ ہے، کام کرتے ہیں
تماشا جب سے دیکھا ہے مِرے دل کے تڑپنے کا
تماشا ہے کہ وہ اپنی نظر سے آپ ڈرتے ہیں
نہیں آتے نہ آئیں وہ، گئے تابِ تواں جائیں
تجھی پر آج ہم اے بے قراری صبر کرتے ہیں
زباں سے گر کیا بھی وعدہ تو نے، تو یقیں کس کو
نگاہیں صاف کہتی ہیں کہ دیکھو یوں مُکرتے ہیں

۱ خاطر سے یا لحاظ سے "میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل دے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
اُلٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ کھو چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں

بات کیا چاہیئے جب مفت کی حجت ٹھہری
اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

رندانِ بے ریا کی صحبت کے نصیب زاہد بھی ہم میں بیٹھ کے انسان ہو گیا

غضب ہے دیکھنا اس سادگی پر مر گئے لاکھوں
کہا تھا کس نے بن بیٹھے وہ میرے سوگواروں میں

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں — صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

دوستی کے پردے میں کون دشمنی کرتا — ان کی مہربانی ہے جو ہے مہرباں اپنا

غیر کے روپ میں بھیجا ہے جلانے کو مرے — نامہ بر اُن کا نیا بھیس بدل کر آیا

غش کھا کے داغ یار کے قدموں میں گر پڑا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

کہیں دنیا میں نہیں اُس کا ٹھکانا اے داغ
چھوڑ کر مجھ کو کہاں جائے مصیبت میری

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

دل کا کیا حال کہوں، صبح کو جب اس بُت نے
لے کے انگڑائی کہا ناز سے "ہم جاتے ہیں"

خبر سُن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے
خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آتا ہے مجھ کو یاد سوالِ وصال پر — کہنا کسی کا ہائے وہ منہ پھیر کر نہیں

ہو کے ظاہر تو کیا عشق نے اِک حشر بپا
حسرت اُس دل پہ کہ جس دل میں یہ پنہاں ہو گا

دل میں سما رہی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ! اِدھر کہاں

روداد محبت کا ہے خدا حافظ
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تُو نے پی ہی نہیں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ یہ ہے کیا بات
وعدہ وہ کرتے ہیں، آتا ہے تبسم مجھ کو

شریر آنکھ، نگہ بیقرار، چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کر دیا کے لئے

رہتا ہے عبادت میں ہمیں موت کا کھٹکا
ہم یادِ خدا کرتے ہیں، کرلے نہ خدا یاد

یہ گستاخی' یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے' اے دلِ ناداں
ابھی پھر رُوٹھ جائیں گے' ابھی تو من کے بیٹھے ہیں

تمہارے خط میں نیا اِک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

تصویر کیوں دکھائیں، تمھیں نام کیوں بتائیں
لائے ہیں ہم کسی سے کسی بے وفا کی ہے

ہوا ہے چار سجدوں پر یہ دعویٰ زاہدو تم کو
خدا نے کیا تمہارے ہاتھ جنّت بیچ ڈالی ہے

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

عاشق ترے عدم کو گئے کس قدر تباہ
پوچھا ہر ایک نے یہ مسافر کہاں کے ہیں

تم خواب میں بھی آئے تو منھ کو چھپا لیا
دیکھو جہاں میں پردہ نشیں اور بھی تو ہیں

خواب میں وعدہ تو مجھ سے کر گئے ہیں وہ ضرور
دیکھئے اس خواب کی ملتی ہے تعبیر کہاں

جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاءاللہ
کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے

لَو لگائے خدا سے بیٹھے تھے
آ گیا بیچ میں خیال ترا

کیونکر اس کی نگہِ ناز سے جینا ہو گا
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہو گا

الٰہی کیوں نہیں آتی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ غیروں کے بیٹھے ہیں

تخلص : درد

نام : خواجہ میر

پیدائش : ۱۷۲۱ء (دہلی)

وفات : ۱۷۸۵ء (دہلی)

تہمت چند اپنے ذمّے دھر چلے — جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

آہ ! بس مت جی جلا تب جانیئے — جب کوئی افسوں ترا اُس پر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا و لے — ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے

ساقیا ! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اُن سے کیا تھا وعدہ مجھے بھول کر کہیں

پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کئے

جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیے — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم — پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

خوابِ عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے
آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا
پَر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحًا لیکن
میں جو پہنچا تو کہا خیر! یہ مذکور نہ تھا

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

کبھو رونا، کبھو ہنسنا، کبھو حیران ہو رہنا
محبّت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

اِک آن سنبھلتے نہیں اب میرے سنبھالے
بے طرح کچھ اِن آنسوؤں نے پاؤں نکالے
پھر آگے قیامت ہے اگر اب بھی نہ آؤ
مر مٹ کے جُدائی کے دن اتنے تو ہیں ٹالے

کچھ ہے خبر تجھے بھی، اُٹھ اُٹھ کے رات کو
عاشق تِری گلی میں کئی بار ہو گیا

نہ پوچھو کچھ ہمارے ہجر کی اور وصل کی باتیں
چلے تھے ڈھونڈنے جس کو سو وہ ہی آپ ہو بیٹھے

ہر چند نہیں صبر مجھے درد و لیکن
اتنا بھی نہ مِلیے کہ وہ بدنام کہیں ہو

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تِری ہرگز
گِلہ تب ہو اگر تُو نے کسی سے بھی نبا ہی ہو

تخلص : **ذوقؔ**

نام : **محمد ابراہیم**

پیدائش : ۱۷۸۹ء (دہلی)

وفات : ۱۸۵۴ء (دہلی)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہم نہیں وہ کہ کریں خون کا دعویٰ تجھ سے
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مُکر جائیں گے

پہنچیں گے رہ گزرِ یار تلک ہم کیوں کر
پہلے جب تک نہ دو عالم سے گزر جائیں گے

ذوقؔ! جو مدرسے سے بگڑے ہوئے ہیں مُلّا
اُن کو مے خانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

لائی حیات آئے قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ، ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے، سو نہایت بُری چلے
ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے، ابھی چلے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یوں ہی جب تک چلی چلے
نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہے وہ ہی ہو
دانش تری نہ میری ہی دانش وری چلے

کس دم نہیں گھُٹتا، مِرا دم سینے میں غم سے
کس وقت مرا منھ کو کلیجہ نہیں آتا
ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھیے آتا بھی ہے دم، یا نہیں آتا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنّت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو   تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ساتھ اُن کے ہوں میں سائے کی مانند لیکن
اس پر بھی جُدا ہوں کہ لپٹنا نہیں آتا

اے شمع تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ مُنھ لگا　　چھُٹتی نہیں یہ کافر منھ سے لگی ہوئی

پھُول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھِلے مُرجھا گئے

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق　　ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ڈال کے

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں　　کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا　　کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

مر گئے پھر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لے جانے میں

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رُکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

موت اس کو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گورنہ
یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

اُلفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے
یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

تخلص : سوداؔ

نام : مرزا محمد رفیع

پیدائش : سنہ ۱۷۱۴ء (دلّی)

وفات : سنہ ۱۷۸۱ء (لکھنؤ)

دل ! مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جُوں اشک ، پھر زمیں سے اُٹھایا نہ جائے گا

رُخصت ہے باغباں کہ ٹک اِک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں ، جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

تیغِ جفائے یار سے دل ! سر نہ پھیریو
پھر مُنھ دِنا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

ظالم میں کہہ رہا تھا کہ اس خُو سے درگزر
سوداؔ کا قتل ہے یہ ، چھپایا نہ جائے گا

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ   کیا جانیے تُو نے اسے کس حال میں دیکھا

مت پوچھو یہ کہ رات کٹی کیونکہ تجھ بغیر
اس جستجو سے فائدہ، پیارے گزر گئی

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب بھلی راتیں
دو چار گھڑی رونا، دو چار گھڑی باتیں

ساقی گئی بہار، رہی جی میں یہ ہوس
تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

اے میاں عشق کے ماروں کا کہیں ٹھور نہیں
دل نہیں، صبر نہیں، آپ نہیں، اور نہیں

مسیحا سُن کے اُٹھ جاوے جو کچھ کہیئے دوا کیجے
محبت سخت بیماری ہے اس کو آہ کیا کیجے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

کہنا کچھ اپنی آنکھ کا دستور ہو گیا — دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسُور ہو گیا

پیغامبر نے دیر لگائی تو ہے ولے — دھڑکے ہے دل کہ یہ نہ کہے "رات ہو گئی"

اِس دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہے الٰہی شتاب ہو

آدم کا جسم جبکہ عناصر سے مِل بنا
جتنی بچی تھی آگ سو عاشق کا دل بنا

فکرِ معاش، عشقِ بُتاں، یادِ رفتگاں،
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

ہوتی نہیں ہے صبح، نہ آتی ہے مجھ کو نیند
جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے "مرکہیں"

ہر آن آ مجھی کو ستاتے ہو ناصحو!
سمجھا کے تم اسے بھی تو اک بار کچھ کہو

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

تخلّص : ظفرؔ
نام : محمد سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ
پیدائش : ۱۷۷۵ء (دہلی)
وفات : ۱۸۶۲ء (رنگون)

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے، میں وہ ایک مُشتِ غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں میں اُجڑ گیا، میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مجھے سُن کے کوئی کریگا کیا
میں بڑے برو‌گ کی ہوں صدا، کسی دل جلے کی پکار ہوں

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
کہہ دو اِن حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اپنے مرنے کا غم نہیں لیکن
ہائے تجھ سے جدائی ہوتی ہے

کچھ خبر قاصد نے دی ایسی کہ سنتے ہی جسے
دل سے میں مجھ سے مرا دل، بے خبر ہونے لگا

تو نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

کیا بات یاد آ گئی اُس کو کہ اے ظفرؔ!
وہ یک بیک جو سن کے مرا نام ہنس پڑا

خدا کے واسطے زاہد، اُٹھا پردہ نہ کعبے کا
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

تخلص : پہلے اسدؔ، پھر غالبؔ

نام : مرزا اسد اللہ خاں

پیدائش : ۱۷۹۷ء (آگرہ)

وفات : ۱۸۶۹ء (دہلی)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ، تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گِرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ! کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تسکیں کو کیوں نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تیری صورت اگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں گے مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اُٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اِک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہگزر یاد آیا

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

اُجالا تو ہوا کچھ دیر کو صحنِ گلستاں میں
بلا سے بجلیوں نے پھونک ڈالا آشیاں میرا

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہے جس دم — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں
نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط — بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

وہ شمع ہوئی روشن وہ آ گئے پروانے
آغاز تو اچھا ہے انجام خدا جانے

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

رخصت کے واقعات کا اتنا تو ہوش ہے
دیکھا کئے ہم اُن کو جہاں تک نظر گئی

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، وہ پریشاں نکلا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بُلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

پلادے ادک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دَورِ جام
ساقی نے کچھ مِلا نہ دیا ہو شراب میں

جب میکدہ چُھٹا تو پھر کیا جگہ کی ہے قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو — اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش ہوا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

کی مِرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

داغِ فراق، صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

تخلص: مجروح

نام: میر مہدی

پیدائش: ۱۸۳۳ء (دہلی)

وفات: ۱۹۰۲ء

شغلِ اُلفت کو جو ارباب بُرا کہتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہتے ہیں
جان دینے کے سوا اور بھی تدبیر کریں
ورنہ یہ بات تو ہم اس سے سدا کہتے ہیں
دے دیا دل ہی تو بدگوئی کا شکوہ کیا ہے
آپ جو کچھ مجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
سیم تن کوئی اسے کہنے لگا، کوئی پری
بولا مجروح سے پوچھو کہ وہ کیا کہتے ہیں

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

تخلّص : مصحفی
نام : شیخ غلام ہمدانی
پیدائش : ۱۷۵۰ء (امروہہ)
وفات : ۱۸۲۴ء (لکھنؤ)

خواب تھا یا خیال، کیا تھا — ہجر تھا یا وصال، کیا تھا
تیرے پہلو میں رات جا کر وہ — ماہ تھا یا ہلال، کیا تھا
جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے — ماہ تھا یا وہ سال، کیا تھا

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جُنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

عشق میں میرے جو گھبرایا تو پھر ناچار ہو
آ کے گھر میرے وہ مجھ کو آپ سمجھانے لگا

دامن کی اک جھپک نے مدہوش کر دیا — مثلِ چراغ ہم کو خاموش کر دیا

تیرے کوچے اِس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو رونا آئے
اور جھپکے تو وہی خوابِ پریشاں دیکھوں

کبھی در کو تک کے کھڑے رہے، کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

خواریاں، بدنامیاں، رُسوائیاں
عشق نے شکلیں یہ سب دکھلائیاں

دیکھتے ہی اُس کے کچھ اِس کی یہ حالت ہو گئی
جو مجھے سمجھائے تھا، میں اُس کو سمجھانے لگا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

جب تک کہ محبّت میں بدنام نہیں ہوتا
اس دل کے تئیں ہرگز آرام نہیں ہوتا

اس وقت کہ شاید تو ہمیں یاد کرے گا
جب جی سے تری یاد میں جائیں گے گزر ہم

بکھیر دے جو وہ زُلفوں کو اپنے مُکھڑے پر
تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چُرا کر
شرما کے جم چلے ہیں سارا بدن چُرا کر

کہتا نہ تھا میں اے دل! جانا نہ اُس گلی میں
آخر تو مجھ پہ آفت، خانہ خراب لا یا

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی!
بھیڑ بیٹے منہ کو بھرے بیٹھے ہیں

سادگی دیکھ کے بوسے کی ہوس رکھتا ہوں
جن لبوں سے کہ میسّر نہیں دشنام مجھے

حسرت پہ اُس مسافرِ بے کس کی روئیے
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے
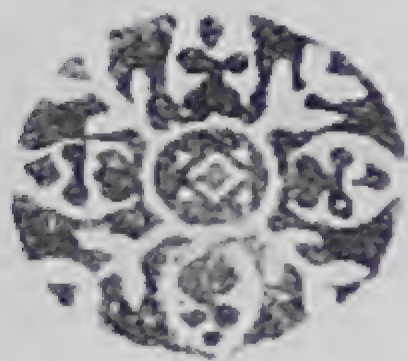
تخلص : **مومن**

نام : **حکیم مومن خاں**

پیدائش : ۱۸۰۱ء (دہلی)

وفات : ۱۸۵۲ء (دہلی)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج، راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
اُس نے کیا جانے کیا کیا لے کر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جُدا نہیں ہوتا

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح
مر چُک کہیں کہ اس غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی و لیکن بُری طرح
نے تابِ ہجر میں ہے، نہ آرام وصل میں
کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے مُنھ سے کیا بھلی
قربان تیرے، پھر مجھے کہہ لے اِسی طرح

نے جائے واں بنے ہے، نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے، ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

عمر تو ساری کٹی عشقِ بُتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مُسلماں ہوں گے

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

میرے گھر بھی چلتے پھرتے ایک دن آجائیگا
دو مبارک باد اب کے یار ہر جائی مِلا

دم بہ دم رونا ہمیں، چاروں طرف تکنا ہمیں
یا کہیں عاشق ہوئے، یا ہو گیا سودا ہمیں

لکھ سلام غیر کے خط میں غلام کو
بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ رُوٹھنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمہارے جی کو بُری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بولنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آں صدا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

رکھ دے سر اپنے زانوئے نازک پہ شوق سے   تیرا مریضِ عشق بہت ناتواں ہے اب

وصال تو ہے کہاں میسّر مگر خیالِ وصال ہی ہیں
مزے اُڑاتے ہوس نکلتی جو ساتھ اندازِ دم نہ ہوتا

دونوں کا ایک حال ہے، یہ مدعا ہو کاش!
خط اس نے میرا بھیج دیا کیوں جواب میں

کیا سُناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے
اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لئے

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی   آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

حسرتیں یوں تو محبت میں بہت ہوتی ہیں
دل میں رکھنے کا نکل آتا ہے ارماں کوئی

ہم بھی تو خوش نہیں وفا کر کے   تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ہم نکالیں گے سُن اے بادِ صبا بل تیرے
اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

تابِ نظّارہ نہیں، آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے

ایک اُن پر ہی نہیں موقوف کچھ اے ہمنوا
میں نے جس کو پیار سے دیکھا وہ قاتل ہو گیا

شوق کم ملنے سے اندوہ فزا ہوتا ہے
ہائے پرہیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے

مکتبِ عشق کا مومن ہے نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلا
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
وہ اگر ہوں گے تو بے وقت پشیماں ہوں گے

شبِ وصال ہے گُل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

نکل آیا اگر آنسو تو ظالم مت نکال آنکھیں
سُنا معذور ہے مضطر، نکل آیا، نکل آیا

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زُلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو
غیر میری لاش کے ہمراہ رونا چاہئے ہے

تھی وصل میں بھی فکرِ جدائی کی سامنے
وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام رات

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر
میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

تخلص : میرؔ

نام : میر محمد تقی

پیدائش : ۱۷۲۳ء (آگرہ)

وفات : ۱۸۱۰ء (لکھنؤ)

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں مُوند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں، ہم کو تو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اُور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا کلیسا، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے، خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا

آیا، یاں سے جانا ہے تو، جی کا کھپانا کیا حاصل
آج گیا یا کل جاوے گا، صبح گیا یا شام گیا

ہائے جوانی کیا کیا کہیئے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے، وہ عہد گیا، وہ موسم، وہ ہنگام گیا

دل کہ اِک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

لب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں مِلا لایا

اب تو جاتے ہیں بُتکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے، اے ہمدم   پر سخن تا بہ لب نہیں آتا
دُور بیٹھا غبارِ میر اُس سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اُس کے گئے یہ دل کی خرابی نہ پُوچھئے
جیسے کِسو کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا
کہتا تھا میر حال تو جب تک، تو تھا بھلا
کچھ ضبط کرتے کرتے تیرا حال کیا ہوا

دُور بہت بھاگو ہو ہم سے، سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا
صورت گر کی پریشانی نے طول نہایت کھینچا ہے
ہم نے کیوں بستار کیا تھا اس کے لمبے بالوں کا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی تصویر کا سر سے مِراسایا نہ گیا
نہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا
ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے اور ہم سے بُجھایا نہ گیا

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی، پر اس کے گئے
ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا
میرؔ مت عذر گریباں کے پھٹے رہنے کا کر
زخمِ دل، چاکِ جگر تھا کہ سِلایا نہ گیا

حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
مُنھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
دل ہے گویا چراغ مُفلس کا
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے

غصّے سے اُٹھ چلے تو ہو دامن کو جھاڑ کر
جاتے رہیں گے ہم بھی گریبان پھاڑ کر
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سُنو ہو، یہ بستی اُجاڑ کر

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں
آنکھیں اگرچہ ہیں تو پھر نیند سو چکا

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

ہم خدا کے کبھی قائل ہی نہ تھے
اُن کو دیکھا تو خدا یاد آیا

دیکھی تھیں ایک روز تیری مست انکھڑیاں
انگڑائیاں سی لیتے ہیں اب تک خمار میں

مرا سر نزع میں زانو پہ رکھ کے یوں لگا کہنے
کہ اے بیمار میرے! تجھ پہ جلد آساں ہو مر جانا

غافل نہ رہیو ہر گز' نادان داغِ دل سے
بھڑکے گا جب یہ شعلہ' تب گھر جلا رہے گا

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم بازی سے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

اُلجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں
دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں	تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ہو گا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ	کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

کیسے ہیں وہ کہ جیتے ہیں صد سال ہم تو میرؔ
اِس چار دن کی زیست سے بیزار ہو گئے

اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
رنجش کی وجہ میرؔ وہ کیا بات ہو گئی

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا	آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم	ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

گزرے ہے لہو واں، سرِ ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

اذاں ہو رہی ہے پلا جلد ساقی	عبادت کروں آج مخمور ہو کر

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

دنیا سے جا رہا ہوں کفن میں چھپا کے منھ
افسوس بعدِ مرنے کے آئی حیا مجھے

کہنے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

جائے ہے جی نجات کے غم میں ایسی جنت گئی جہنم میں
موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

تخلّص : ناسخ
نام : شیخ امام بخش
پیدائش : ۷۲-۱۷۷۱ء (فیض آباد)
وفات : ۱۸۳۸ء (لکھنؤ)

واعظا! مسجد سے اب جاتے ہیں میخانے کو ہم
پھینک کر ظرفِ وضو لیتے ہیں پیمانے کو ہم
کون کرتا ہے بُتوں کے آگے سجدہ زاہدا!
سر کو دے دے مار کر توڑیں گے بتخانے کو ہم
باندھتے ہیں اپنے دل میں زُلفِ جاناں کا خیال
اس طرح زنجیر پہناتے ہیں دیوانے کو، ہم
عقل کھودی تھی جو اے ناسخ! جنونِ عشق نے
آئینہ سمجھا کئے اِک عمر بیگانے کو ہم

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی   شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا

پھر بہار آئی چمن میں، زخمِ دل آلے ہوئے
پھر مرے داغ جگر آتش کے پرکالے ہوئے

کس طرح چھوڑوں یکایک اس کی زلفوں کا خیال
ایک مدت سے یہ کالے ناگ ہیں پالے ہوئے

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں　　ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

غم دیا، رنج دیا، درد دیا، داغ لیا
ہو سکے مجھ سے عوض کیا ترے احسانوں کے

زندگی زندہ دلی کا نام ہے　　مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

بھولے نہ بعدِ مرگ بھی ہم رقصِ یار کو　　ٹھوکر کی آرزو ہے ہمارے مزار کو

تخلص : **نسیم لکھنوی**

نام : **پنڈت دیا شنکر**

پیدائش : سنہ ۱۸۱۱ء (لکھنؤ)

وفات : سنہ ۱۸۴۳ء (لکھنؤ)

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا
روحِ رواں جسم کی حالت میں کیا کہوں
جھونکا ہوا کا تھا، اِدھر آیا، اُدھر گیا
گزرا جہاں سے میں تو کہا ہنس کے یار نے
"قصہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا"

لائے اس بت کو التجا کر کے   کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

جو دن کو نکلو تو خورشید دردِ سر نکلے
چلو جو شب کو تو قدموں پہ ماہتاب گرے

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ   بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا

تمھیں رقیب کی خاطر ہے، لو میں جاتا ہوں
اُٹھائیے نہ حیا کو، بٹھائیے نہ مجھے

دوزخ و جنّت ہے اب میری نظر کے سامنے
گھر رقیبوں نے بنایا، اس کے گھر کے سامنے

بُتوں کی گلی چھوڑ کر کون جائے　　یہیں سے ہے کعبے کو سجدہ ہمارا

بُوئے گُل غنچے سے کہتی ہے نسیم　　بات نکلی منھ سے افسانہ چلا

عشق کے رُتبے کے آگے آسماں بھی پست ہے
سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

کیا کیا حسیں چُھپے ہوئے مٹّی میں مل گئے
افشاں سمجھ کے خاک سے ذرّہ اُٹھائیے

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

تخلص : **نظیر اکبر آبادی**

نام : **سیّد ولی محمدؐ**

پیدائش : ۱۷۳۵ء (دہلی)

وفات : ۱۸۳۰ء (آگرہ)

دُور سے آئے تھے ساقی سُن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس، پیمانے کو ہم

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم

طاقِ ابرو میں صنم کے کیا خدائی رہ گئی
اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بُتخانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیر
تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مرجانے کو ہم

قسمت میں گر ہماری یہ مے ہے تو ساقیا! بے اختیار آپ سے شیشہ کرے گا جست

یوں کھول کے رُخسار پہ کاکل سرِ محفل
غافل نظرِ بد سے، مری جان نہ بیٹھو

نازُ اٹھانے میں جفائیں تو اُٹھائیں لیکن
لُطف بھی ایسا اُٹھایا ہے کہ جی جانے ہے

خدا کی شان جنہیں بات کرنہ آتی تھی
وہ اب کرے ہیں سوال و جواب آنکھوں میں

آپ ہی کیا ہے اپنے گریباں کو ہم نے چاک
آپ ہی سیا، سیا نہ سیا، پھر کسی کو کیا

جدھر دیکھے اُدھر وہ صف کی صف اُلٹ دے ہے
بھری ہے شوخ کے ایسی شراب آنکھوں میں

طرح دینا، اُڑا دینا، لگا دینا، بجھا دینا
یہ ڈھب ہیں یاد تِس پر کچھ فریب اور فن نہیں آتا

جس کام کو جہاں میں تو آیا تھا اے نظیرؔ!
خانہ خراب، تجھ سے وہی کام رہ گیا

تخلص : **وَلی دکنی**

نام : **محمد ولی اللہ**

پیدائش : ۱۶۶۷ء (اورنگ آباد)

وفات : ۱۷۴۱ء (احمد آباد)

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اُسے زندگی جگ میں بھاری لگے

نہ چھوڑے محبت دم مرگ تک
جسے یار جانی سُوں یاری لگے

نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشقِ زار کوں
پیارے تری بات پیاری لگے

وَلی کوں کہے تو اگر اک بچن
رقیبوں کے دل میں کٹاری لگے

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
عشق کا اعتبار کھوتی ہے

اے وَلی اس بے وفا کی مہربانی پر نہ بھول
دل کا دشمن ہے اگر کرتا ہے باتیں پیار کی

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو
کرتی ہے نگاہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لیجائے

مجھ کو ہوا ہے معلوم، اے مستِ جامِ خونی
تجھ انکھڑیوں کے دیکھے عالم خراب ہو گا

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق
کوچۂ زلف ہے، یا گوشۂ تنہائی ہے

زندگی جامِ عیش ہے لیکن　　فائدہ کیا اگر مدام نہیں

تخلص : **آبرو**

نام : **نجم الدین شاہ مبارک**

پیدائش : گوالیار

وفات : ۱۷۵۰ء (دہلی)

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو، آج پھر گیا

ٹک باغ میں شتاب چلو، اے بہارِ حسن
گُل، چشم ہو رہا ہے، تمہارے نظارے کو

جلتا ہے اب تلک ترے مکھڑے کے رشک سے
ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گُل

یار غافل ہے مرے دردِ نے بیدار کرو
بے خبر جان، نہ جا جل کے خبردار کرو

کیوں ملامت اس قدر کرتے ہو بے حاصل ہے یہ
لگ چکا اب چھوٹنا مشکل ہے اس کا، دل ہے یہ

تخلص : **آرزو**

نام : **سراج الدین علی خاں**

پیدائش: ۱۶۸۷ء (آگرہ)

وفات : ۱۷۵۶ء (لکھنؤ)

داغ چھوٹا نہیں، یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دُکھ گئے، دامن ترا دھوتے دھوتے

کِس پری رُو سے ہوئی شب کو مِری چشم دوچار
کہ میں دیوانہ اُٹھا، خواب سے سوتے سوتے

عبث دل بےکسی اپنی پہ تُو ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دیوانے عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے

پھرتے تھے دشت دشت دیوانے کدھر گئے
وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

تجھ زُلف میں اٹک نہ رہے، دل تو کیا کرے
بیکار ہے اٹک نہ رہے، دل تو کیا کرے

تخلص : آزردہ
نام : مفتی صدرالدین
پیدائش : ۱۷۸۹ء (دہلی)
وفات : ۱۸۶۸ء (دہلی)

یارب! یہ کس نے چہرے سے اُلٹا نقاب ہے
سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

میں اور ذوقِ بادہ کشی، لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہدِ شباب میں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اِک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

تخلّص : آشفتہ

نام : عظیم الدین عرف بھولے خاں

وفات : ۱۷۹۸ء

جامِ گدائی ہاتھ میں لے نِت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حُسن کے تیرے پھرتے ہیں
مدّت سے ہے اخترِ طالع، ماہِ جبیں بن گردش میں
کھول تو باہمن پوتھی اپنی کب دن میرے پھرتے ہیں
پنڈت پوچھو، ہاتھ دکھاؤ، فال کھُلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے، کس کے پھیرے پھرتے ہیں
عقل و فراست سلب ہوئے ہلئے جنوں رے وائے جنوں
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں
یوں کاندھے پر زُلفیں اس کی بل کھاتی ہیں وقتِ خرام
مارِ سیاہ کو ڈالے گلے ہیں جیسے سپیرے پھرتے ہیں

دل دیتا ہے ہر پھر کے اسی در پہ صدائیں
دیوانہ بنا ہے، ابھی دیوانہ نہیں ہے

تخلص : **اثر**

نام : **سید محمد میر**

پیدائش : (دہلی)

وفات : ۱۷۹۴ء،۹۵ (دہلی)

راہ پران کو لگالائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

تجھ سے نہ تھا جو کچھ کہ گماں سو یقیں ہوا
جو تجھ سے تھا یقیں، سو اب اس کا گماں نہیں

جانتا کچھ قدر ہماری بھی
تو بھی عاشق اگر ہوا ہوتا
بے وفائی پہ تیری جی ہے فدا
قہر ہوتا جو باوفا ہوتا

نہیں معلوم دل پہ کیا گزری
اِن دنوں کچھ خبر نہیں آتی
دن کٹا جس طرح کٹا لیکن
رات کٹتی نظر نہیں آتی

تخلص : اختر

نام : قاضی محمد صادق خاں

پیدائش : کلکتہ

وفات : ۱۸۵۸ء (اٹاوہ)

جو اُٹھ گئے پاس سے پر دھیان تمہارا
جائے گا کہاں دیدۂ حیراں سے نکل کر
یاں تنگ تو ہی لائی نہ ستا اب مجھے وحشت
میں اور کہاں جاؤں بیاباں سے نکل کر

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حیا
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
سینے سے اپنا سینہ ملا کر وہ منھ سے منھ
یہ دلِش جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

تخلص : **ارشد**

نام : **مرزا عبدالغنی گورگانی**

پیدائش : ۱۸۵۰ء (دہلی)

وفات : ۱۹۰۶ء (ملتان)

الٰہی جان دی ہے میں نے کس کے رُوئے روشن پر
ہزاروں شمعیں پروانہ بنی ہیں میرے مدفن پر
تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی
چڑھا ہے خون کس کس بے گنہ کا اس کی گردن پر
وہ بے انصاف اور اپنی وفا کی داد یا قسمت!
گمانِ دوستی ہے سادگی سے ہم کو دشمن پر
عجب اس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہے
نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر
میں ہوں مرہونِ منت صلحِ کُل کا جب سے اے ارشد
یقینِ دوستی ہونے لگا ہے مجھ کو دشمن پر

تخلص : **اسیر لکھنوی**

نام : **میر مظفر علی خاں**

پیدائش : ۱۸۱۳ء (امیٹھی)

وفات : ۱۸۸۱ء (لکھنؤ)

باقی ابھی ہے ترکِ تمنا کی آرزو
کیوں کر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

کعبے چلتا ہوں، پر اتنا تو بتا
میکدہ کوئی ہے زاہد! راہ میں

روز کے وعدوں پہ مر جائیں گے ہم
یوں ہی گزری تو گزر جائیں گے ہم

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے
روشن اسی کا نام رہے جو جلائے دل

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے محفل کی

تخلص : **افسوس**

نام : **میر شبیر علی**

پیدائش: ۱۷۳۲ء (دہلی)

وفات : ۱۸۰۹ء (کلکتہ)

کیا فائدہ جو پوچھے تو احوالِ دل افسوس سے
مُنھ دیکھ رو دیتا ہے وہ، پر بات کچھ کہتا نہیں

کیا لکھوں اُس کو میں احوال یہ کہنا قاصد
بے حواسی کے سبب طاقتِ تحریر نہیں

دیکھتے ہی اُنہیں، حاضر ہوئے مر جانے کو
وہی اشخاص جو واں آئے تھے سمجھانے کو

کچھ بات مجھ سے کر نہیں سکتے ہزار حیف
مدّت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے
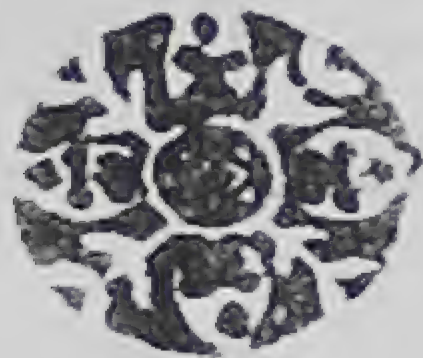
تخلص : امانت

نام : سیّد آغا حسن

پیدائش : ۱۸۱۴ء (لکھنؤ)

وفات : ۱۸۵۸ء (لکھنؤ)

مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اُسے گلے
بہکا جو پاؤں، ہاتھ کمر سے نکل گیا

کوچۂ قاتل تلک اے دل! رسائی کیجئے
کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجئے

جانے نہ دوں گا آپ کو، سُننے کا میں نہیں
باتیں بنا کے وصل کا وعدہ نہ ٹالیئے

نامحرموں کی آنکھ نہ انگیا پہ جا پڑے
سینہ کُھلا ہوا ہے، دوپٹا سنبھالیئے

جی چاہتا ہے صنعتِ صانع کے ہوں نثار
بُت کو بٹھا کے سامنے، یادِ خدا کریں

تخلص : انجامؔ

نام : نواب امیر خاں

پیدائش : دہلی

وفات : ١٧٤٧ء (دہلی)

ٹک تو دے فرصت کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدّتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم
منھ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حُسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانندِ شررِ جب کر چلے برباد ہم
ساتھ اپنے سر کے تھا انجامؔ پاسِ تمکنت
شکر ہے، تڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم

تخلص : **انیسؔ لکھنوی**

نام : **میر ببر علی**

پیدائش: ۱۸۰۱ء (فیض آباد)

وفات : ۱۸۷۴ء (لکھنؤ)

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لال آبلے، پائے نگاہ میں

تمام عمر جو کی ہم سے بے رُخی سب نے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے مُنہ چُھپا کے چلے

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں اِن زمینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

تخلص : سحر

نام : شیخ امداد علی

پیدائش : سنہ ۱۸۱۰ء (لکھنؤ)

وفات : سنہ ۱۸۸۲ء (لکھنؤ)

آنکھیں نہ جینے دیں گی تری بے وفا مجھے
اِن کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

گئی برسات، گزرا سال یہ بھی آہ وحشیوں میں
خبر ہم کو نہیں، بادل کدھر آیا، کدھر برسا

دوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو
نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

ظالم! ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی
پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

تخلص : **برق**

نام : **مرزا محمد رضا**

پیدائش : لکھنؤ

وفات : ۱۸۵۷ء (کلکتہ)

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو
غم میں پھنسا ہوں دامِ محبت سے چھوٹ کر

نکلا غبار دل سے، صفائی تو ہو گئی
اچھا ہوا جو خاک میں تم نے مِلا دیا

ہم تو اپنوں سے بھی بیگانہ ہوئے اُلفت میں
تم جو غیروں سے ملے، تم کو نہ حیرت آئی

قیس کا نام نہ لو، ذکرِ جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم، موسمِ گُل آنے دو

اذاں دی کعبے میں، ناقوس دَیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق، تجھے پکار آیا

تخلص : بیاںؔ

نام : خواجہ احسن اللہ خاں

پیدائش : دہلی

وفات : ۱۷۹۹ء (حیدر آباد)

رُسوا ابھی سے کرتی ہے اے چشمِ تر مجھے
آنا ہے اس کی بزم میں، بارِ دگر مجھے

عرش تک جاتی تھی، اب لب تک بھی آسکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاںؔ! اب مجھ کو اپنی آہ پر

صاف مُنھ پر میں نہیں کہتا کہ ہوگا اس کے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں میں، دل ہے میرا جس کے پاس

کافر ہوں گر زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو
اِک بے خلل مکاں ہو، بس میں ہوں اور تُو ہو

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کہ مثلِ خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

تخلص : بیدار

نام : **میر مہدی**

پیدائش: دہلی

وفات : ۱۷۹۴ء (دہلی)

نے بُت کدے سے کام، نہ مطلب حرم سے تھا
محوِ خیالِ یار رہے، ہم جہاں رہے

ہم خاک بھی ہو گئے پہ لیکن
جی سے نہ تیرے غبار نکلا

دامن کو تیرے نہ پہنچے اب تک
ہر چند غبار ہو گئے ہم

کِس کِس کا دل نہ شاد کیا تُو نے اے فلک
اِک میں ہی غمزدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا

بیدار راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی
صحرا میں قیس، کوہ میں فرہاد رہ گیا

تخلص : تاباںؔ

نام : میر عبدالحیؔ

پیدائش : ۱۷۰۸ء (دہلی)

وفات : ۱۷۵۹ء یا ۱۸۰۰ء (دہلی)

آگے تو بہت دھوم تھی مجنوں کے جنوں کی
اب گرم میرے دم سے ہے، بازارِ محبت
ناصح جو ترے جی میں ہو سو مجھ سے کرا لے
کرنے کا نہیں ایک میں انکارِ محبت

ہوا جا کے ظالم کے قابو میں بے بس
کہا ہائے اِس دل نے میرا نہ مانا
ترے غم میں نسیاں ہے یاں تک کہ مجھ کو
اِدھر بات کہنا، اُدھر بھول جانا

دیکھا جو میری نبض کو، کہنے لگا طبیب
مجنوں مرا تھا جس سے یہ آزار ہے یہی

تخلص : تسکین

نام : میر حسین

پیدائش : ۱۷۹۹ء (دہلی)

وفات : ۱۸۴۹ء (رامپور)

کرسکے دفن نہ اس کوچے میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

ہجر میں پاس نہ ہے زہر، نہ خنجر افسوس
نہ دیئے موت کے بھی چرخ نے اسباب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی
بات تو کرنے دے اس سے دلِ بیتاب مجھے

شبِ وصال میں سُننا پڑا فسانۂ غیر
سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے

ابھی اِس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

تخلص : تسلیم

نام : شیخ امیر اللہ

پیدائش : ۱۸۲۰ء (منگلیسی۔فیض آباد)

وفات : ۱۹۱۱ء (رامپور)

کل مرا تھا آج وہ بت غیر کا ہونے لگا
وائے قسمت دو ہی دن میں کیا سے کیا ہونے لگا

یاد میری آگئی، منھ پھیر کر رونے لگے
انجمن میں اُن کی جب ذکرِ وفا ہونے لگا

ہائے! کب اُس نے نکالے اپنے پیکاں کھینچ کر
درد کی لذّت سے جب دل آشنا ہونے لگا

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے اُٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

سچ ہے تمھیں کسی سے نہ مطلب، نہ کچھ غرض
دن رات گھر میں غیر کے مہماں ہمیں تو ہیں

جی میں آتا ہے کہ اِک دن مر کے ہم ہمّتِ دوشِ عزیزاں دیکھ لیں
التفاتِ جوشِ وحشت پھر کہاں ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں

گر انھیں ہے خوفِ عرضِ آرزو   دُور سے حالِ پریشاں دیکھ لیں

چشمِ ساقی آگئی ہے یاد کس مے نوش کو
جام چھلکا، شیشۂ مے ہچکیاں لینے لگا

محبت میں یہ بے رحمی کہ جینا ہو گیا مشکل
خدا نا کردہ کیا ہوتا جو وہ کافر عدو ہوتا

واعظ خدا شناس نہ ہو گا تمام عمر
اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں

کرتے ہیں سجدے اس لئے دیر و حرم میں ہم
کیا جانیئے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو

عہد کے بعد لئے بوسے دہن کے اتنے
کہ لبِ زُود پشیماں کو مکرنے نہ دیا

تخلص : تشنہ

نام : محمد علی

پیدائش : دہلی

وفات : دہلی

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گُل بھی ہے، بُلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے، سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اِک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ!
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں
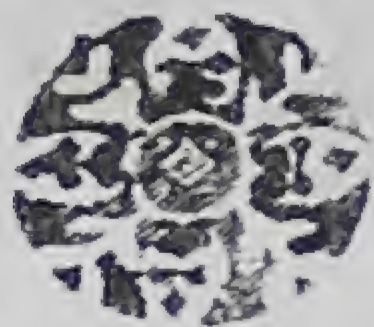
تخلص : **تعشق لکھنوی**

نام : **سیّد مرزا**

پیدائش : ۱۸۲۲ء (لکھنؤ)

وفات : ۱۸۹۱ء (لکھنؤ)

بے وفائی آپ کی، غفلت شعاری آپ کی
میرے دل نے عادتیں سیکھی ہیں ساری آپ کی

تمام رات رہا دل سے ذکرِ خیر ترا
گلہ کیا ہو تو شاہد ہے آرزو تیری

مجھ سے کیا پوچھتے ہو داغ ہیں دل میں کتنے
تم کو ایامِ جدائی کا شمار آتا ہے

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

وہ کھڑے کہتے ہیں میری لاش پر
ہم تو سنتے تھے کہ نیند آتی نہیں

تخلص : جرأت

نام : شیخ قلندر بخش

پیدائش : دہلی

وفات : سنہ ۱۸۱۰ء (لکھنؤ)

ہے غضب اپنی طبیعت اس پہ ہے آئی ہوئی
جس پہ پڑتی ہے نگہ ہر اک کی للچائی ہوئی

یاد آجاتی ہے تو روتا ہوں کیا منھ ڈھانپ ڈھانپ
بھولی بھولی صورت اور وہ آنکھ شرمائی ہوئی

چھانی برسات میں چھائی کہاں جلد آؤ جی
جی گھٹاتی ہے ہمارا یہ گھٹا چھائی ہوئی

سامنے میرے جو منھ کر کے نہیں تم بیٹھتے
کیا کسی کے سامنے ہے یہ قسم کھائی ہوئی

بس یہ حیرت ہے مجھے اس پر نہ تم ٹھہرے رہے
بات تو مدت سے ہے آپس میں ٹھہرائی ہوئی

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر "نہیں، نہیں"

کیا رُک کے وہ کہے ہے جو ٹک اُس سے لگ چلوں
بس بس پرے ہو شوق سے اپنے تئیں نہیں"
پہلو میں کیا کہیں جگر و دل کا کیا ہے رنگ
کس روز اشکِ خونیں سے تر آستیں نہیں
فرصت جو پا کے کہیئے کبھو دردِ دل تو ہائے
وہ بدگماں کہے ہے کہ، ہم کو یقیں نہیں
اُس بِن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی
گویا وہ آسمان نہیں، وہ زمیں نہیں
آنکھوں کی راہ نکلے ہیں، کیا حسرتوں سے جی
وہ رُوبرد جو اپنے دمِ واپسیں نہیں
حیرت ہے مجھ کو کیونکہ وہ جرأت ہے جبین سے
جس بِن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہیگا بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے، کہاں ہوتا ہے

واں سے آیا ہے جوابِ خط کوئی سنیئے تو ذرا
میں نہیں ہوں آپ میں، مجھ سے نہ سمجھا جائے گا

خدا جانے کرے گا چاک کس کس کے گریباں کو
ادا سے ان کے چلنے میں وہ دامن کا اُٹھا لینا

ملکِ دل میرا سدا سنسان ہی رہتا ہے آہ
سب نگر بستے ہیں یارب! اس نگر کو کیا ہوا

آئے جو میرے پاس تو مُنھ پھیر کے بیٹھے
یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

لوگ سب کہتے ہیں اِس بیمارِ غم کو کیا ہوا
جانتے ہم بھی نہیں ہیں یہ کہ ہم کو کیا ہوا

جتاؤں دردِ محبت تو کس ادا سے کہے
"کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دیوانے پن کی سی"

کیا ہجومِ بدگمانی گھیر لیتا ہے مجھے
جب یہ سُنتا ہوں کہیں گھر سے وہ تنہا جائے ہے

دل کو اے عشق سوئے زُلفِ سیاہ فام نہ بھیج
رہزنوں میں تو مسافر کو سرِ شام نہ بھیج

نالہ و آہ و فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

دلِ وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی
دیوانہ ہے وہ لیکن بات کرتا ہے ٹھکانے کی

رکھیو یارب تو پھنسا دل کو گرفتاری میں
موت بھی آوے تو آوے اِسی بیماری میں

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں کا داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

تخلص : **جوشؔ لکھنوی**

نام : **احمد حسن خاں**

پیدائش: ۱۸۲۶ء (لکھنؤ)

وفات : ۱۸۸۶ء

مجھ جاں بہ لب کے پاس سے جاتے ہو گھر کہاں
پھر تم کہاں، یہ عاشقِ خستہ جگر کہاں
کہتے ہو کیا حضور کہ آئیں گے وقتِ صبح
اِس شب کو خاتمہ ہے ہمارا، سحر کہاں

مر مر کے اگر شام تو رو رو کے سحر کی
یوں زندگی ہم نے تری دُوری میں بسر کی

سچ کہتے ہیں کہ نام محبت کا ہے بُرا
اُلفت جتا کے دوست کو دشمن بنا لیا

حسرتیں مُردہ دلوں کی کبھی زندہ نہ ہوئیں
نام رکھا ہے عبث تم نے مسیحا اپنا

تخلص : **جوشش**

نام : **شیخ محمد روشن**

پیدائش : عظیم آباد (پٹنہ)

وفات : تیرھویں صدی ہجری

نہ پھولتے ہیں شگوفے، نہ غنچے کھلتے ہیں
چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا

قیس پھرتا جو رہا دشت میں دیوانہ تھا
اُس کو لیلےٰ ہی کے دروازے پہ مرجانا تھا

نگاہِ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے
سلام اس نے ہمارا لیا لیا، نہ لیا

کل بزم میں سب پر نگہِ لطف و کرم تھی
اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا

جز چشمِ بتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

تخلص : حاتم

نام : شیخ ظہور الدین شاہ

پیدائش: ۱۶۹۹ء (دہلی)

وفات : ۱۷۹۱ء (دہلی)

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
جہاں کے کام تھے جتنے، تمام بھول گئے
گئے تھے زعم میں اپنے، پر اُس کو دیکھتے ہی
جو دل نے ہم سے کہے تھے، پیام بھول گئے

سر کو پٹکا ہے کبھو، سینہ کبھو کوٹا ہے
رات بھر ہجر کی دولت کا مزہ لوٹا ہے

اے یار مت اُڑا تو گریباں کی دھجیاں — لے ہے جنوں حساب یہاں تار تار کا

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو — اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا
مانندِ خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

تخلص : حسرتؔ

نام : مرزا جعفر علی

پیدائش : دہلی

وفات : ۱۸۰۲ء (لکھنؤ)

تمہیں غیروں سے کب فرصت، ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی، نہ ہم خالی

یہ بھی اِک ستم تھا کہ خواب میں مجھے اپنی شکل دکھا گئے
کبھی نیند نہ برسوں میں آئی تھی، سو وہ اس طرح سے جگا گئے

کل کسی نے جو کہا مرتا ہے عاشق تیرا
ہنس کے غیروں کی طرف کہنے لگا "اور سُنو"

کِس کِس طرح سے ہم نے کیا اپنا جی نثار
لیکن گئیں نہ دل سے ترے بدگمانیاں

موت آجائے کہیں، اِس دلِ شیدائی کو   روز سمجھائیے کہاں تک کوئی سودائی کو

بھولتا ہی نہیں وہ، دل سے، اسے   ہم نے سو سو طرح بُھلا دیکھا

تخلص : حسنؔ

نام : میر غلام حسین

پیدائش: سنہ ۱۷۲۷ء (دہلی)

وفات : سنہ ۱۷۸۶ء (لکھنؤ)

جاتا ہوا اُس کی کھوج میں، میں بے خبر چلا
بارے اسی نے ٹوک کے پوچھا، کدھر چلا

غیروں میں اس نے منھ تو چھپایا تھا مجھ کو دیکھ
پر میں بھی اس کی بھیڑ سے مُنھ ڈھانپ کر چلا

لکھنے کی یاں نہ تاب، نہ پڑھنے کا واں دماغ
کہہ دیں گے کچھ زبانی اگر نامہ بر چلا

کچھ رات غیر کی جو کہیں نکلی اس سے بات
سُن سُن کے میں خفا ہو وہیں رُوٹھ کر چلا

غصّے میں دیکھ مجھ کو لگا کہنے، اور لو
اِک بات بس کہی نہ کہی، میں تو مر چلا

دونوں دیوانے ہیں کیا سمجھیں گے آپس میں عبث
ہم کو سمجھاتا ہے دل اور دل کو سمجھاتے ہیں ہم

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

جان و دل ہیں اُداس سے میرے
اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

دی تھی یہ دُعا کس نے مرے دل کو الٰہی!
اُجڑے یہ گھر ایسا کہ پھر آباد نہ ہووے

وہ رُخسارِ نازک کہ ہو جائے لال
اگر اُس پہ بوسے کا گزرے خیال

برس پندرہ کا یا سولہ کا سِن
جوانی کی راتیں، مُرادوں کے دن

تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں
جی دھڑک جاتا ہے میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

تخلص : ذکی

نام : نواب سیّد محمد ذکریا خاں

پیدائش : ۱۸۳۹ء (دہلی)

وفات : ۱۹۰۳ء (بدایوں)

پھر آج دیکھیے کِس کِس کی جان جاتی ہے
وہ گھر سے نکلے ہیں عالم کی آرزو ہو کر

کِس نے حیا سے نیچی نظر کی کہ ہو گیا
آساں نہ دیکھنا، مجھے دشوار دیکھنا

ہو حسرتوں سے پوچھنا میرا کہ 'جاؤ گے؟'
اُن کا وہ ایک ناز سے کہنا کہ 'ہاں چلے'

تغافل 'سازگارِ شوقِ اہلِ درد کیا ہوگا
ادا سے دو فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہو جائے
نہ کہنا غیر سے قاصد کہ میں مطلب نہیں سمجھا
پیامِ یار رہے بے معنیٰ بیگانہ ہو جائے

تخلص : ذکی

نام : شیخ مہدی علی خاں

پیدائش : ۱۷۹۳ء (لکھنؤ)

وفات : ۱۸۶۶ء (انبالہ)

قاصد کے ہوش گُم تھے، یہ طرفہ ماجرا تھا
کہتا تھا کچھ زبانی اور خط میں کچھ لکھا تھا
اِک بات پر تمہاری سوجی سے ہم تھے قربان
کچھ بات اب نہ پوچھو، کیا جانئے وہ کیا تھا

جا بہ جا چرچے ہوئے، جب ہوئے ہم سے دوچار
کھُل گیا راز، پڑی بات جو، دو چار کے مُنھ

اب سبب کیا ہے، جو کانٹا سا کھٹکتا ہے ذکی
یہی وہ دل ہے جو رہتا تھا سدا آنکھوں میں

اِک ذرا تیغِ نگہ کو جو اشارا ہو جائے
آپ کا نام ہو اور کام ہمارا ہو جائے

تخلص : **راسخ**

نام : **شیخ غلام علی**

پیدائش : ۱۷۴۸ء (عظیم آباد - پٹنہ)

وفات : ۱۸۲۲ء (عظیم آباد - پٹنہ)

صبح سے ہے بیتابی جی کو، آہ! نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھیئے کیا ہو شام تلک، جی آج بہت گھبراتا ہے

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر
قاصد نے اُن کے آنے کی دل سے بنائی بات

سونپا ہوا داغ اُن کا تازہ ہی سدا رکھا
ہم نے بھی امانت کو چھاتی سے لگا رکھا

آنے میں سدا دیر لگاتے ہی رہے تم
جاتے رہے ہم جان سے آتے ہی رہے تم

راسخ کی فاقہ مستی سے اللہ کی پناہ
کھاتا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

تخلص : رِند

نام : سیّد محمد خاں

پیدائش : ۱۷۷۹ء (فیض آباد)

وفات : ۱۸۵۷ء (بمبئی)

دل سینے میں بیتاب ہے، جاں آئی ہے لب پر
اب جان کو روکے کوئی یا دل کو سنبھالے
آنکھیں تری مدہوش ہیں، تنہا ہے مِرا دل
دو مست نہ سنبھلیں گے اکیلے کے سنبھالے

ہو کے بیزار عبث گھر کو نہ جاؤ، آؤ
تھوڑے سے رنج کو اتنا نہ بڑھاؤ، آؤ
دل نہیں دیتا میں اِس بات پہ آزردہ ہو
رُوٹھے جاتے ہو اسی بات پہ، آؤ آؤ

پاسِ دیں کفر میں رہا ملحوظ بُت کو پوجا خدا کر کے

سیر کی، خوب پھرے، پھول چُنے، شاد رہے
باغباں جاتے ہیں، گلشن ترا آباد رہے

تخلص : رنگین

نام : مرزا سعادت یار خاں

پیدائش : ۱۷۵۵ء (سردھنا)

وفات : ۱۸۳۵ء

پنکھڑی گل کی جو کروٹ تلے اُس کے آئے
نازک اِتنا ہے بدن، اُس کا نشاں رہتا ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

کیا کرتے ہو ناصح تم نصیحت رات دن مجھ کو
اسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

دل کو خوں اور حنا کو بھاگ لگے
اِس تری منصفی کو آگ لگے

غم نہیں مرنے کا اپنے مجھے یہ سوچ ہے آہ
کون اُٹھائے گا ترے جور و جفا میرے بعد

تخلص : **سالک** (پہلا تخلص قربانؔ)

نام : **مرزا قربان علی بیگ خاں**

پیدائش : ۱۸۲۴ء (حیدرآباد)

وفات : ۱۸۸۱ء (حیدرآباد)

یوں عمر گزاری تری فرقت میں کہ ہر دم   جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا

نہیں اِک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں
پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی
لے وفا تُو بھی اُسے لے کے پشیماں ہوگا

تم غیر کے ہوئے تو رہا کیا جہان میں   گویا ہمارے واسطے بھی کچھ بنا نہ تھا

کہلاتے ہو کیوں وعدہ فراموش جہاں میں
آجاؤ کہ میں آپ میں اکثر نہیں ہوتا

کس کو دل دیتے ہو کیا کرتے ہو دیکھو سالک
ہائے نادان بنے جاتے ہو، دانا ہو کر

زباں کٹ جائے، گر لب سے تمہارا کچھ گِلا نکلے
مگر یہ تو کہوں گا، تم کو کیا سمجھے تھے، کیا نکلے

پہنچے عدو کے گھر میں تو دامن جھٹک دیا
ہم خاک بھی ہوئے ہیں تو مٹی خراب ہے

جانے دے اے تصورِ جاناں نہ کر تلاش
ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دشمن کے گھر ملے

وہ دشمن، دوست ہو یا آسماں ہو
اجل بن کر ہی کوئی مہرباں ہو

رگ رگ میں نیشِ عشق ہے اے چارہ گر مرے
یہ درد وہ نہیں کہ کہیں ہو، کہیں نہ ہو

تم بھی وہی کہو تو کہے اِک جہاں بجا
میں بھی وہی کہوں تو کہے اِک جہاں غلط

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

تخلص : سراج دکنی

نام : **میر سراج الدین**

پیدائش : ۱۷۱۵ء (اورنگ آباد)

وفات : ۱۷۶۱ء (اورنگ آباد)

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا گِلہ کس زباں سے ادا کروں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی
کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خطری رہی

ڈورے نہیں ہیں سُرخ، تِری چشمِ مست میں
شاید چڑھا ہے خون، کسی بے گناہ کا

تخلص : سوز

نام : سید میر محمد

پیدائش: ۱۷۲۰ء (دہلی)

وفات : ۱۸۰۰ء (دہلی)

غم ہے یا انتظار ہے، کیا ہے   دل جواب بیقرار ہے کیا ہے

مکر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھنگ نکالا ہے
ہر اک سے پوچھتا ہے اس کو کس نے مار ڈالا ہے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا   پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

کہاں میں اور کہاں اندیشۂ بوس و کنار اُس کا
نہ بھائی یہ خیالِ خام مجھ سے ہو نہیں سکتا

ابر کے قطرے سے ہو جاتے ہیں موتی ناصح!
کیا ہمیں رونے سے کچھ اپنے نہ حاصل ہوگا

خدایا! کس کے بندے ہم کہاویں سخت مشکل ہے
رکھے ہے ہر صنم اِس دہر میں دعویٰ خدائی کا

تمنا پیش کش، امید صدقے، آرزو قرباں
میں اپنے دل کی حسرت اپنے دل میں لے کے جاؤنگا

تُو روزِ وصل اے سوز! اپنے آنسو پونچھ
ابھی بہت ہے تجھے ہجرِ یار میں رونا

اے سوز! عزمِ کوچۂ قاتل نہ کر عبث
تُو ایک بھی بتا دے کہ واں جا کے آسکا

عاشق ہوا، اسیر ہوا، مُبتلا ہوا
کیا جانیئے کہ دیکھتے ہی دل کو کیا ہوا

سر زانو پہ ہو اُس کے اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلّم ہے، ارمان نکل جائے

جنازے والو! نہ جھجکیے قدم بڑھائے چلو
اسی کا کوچہ ہے، ٹک کرتے ہائے ہائے چلو

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہوگیا
آہ! یارب، رازِ دل اُن پہ بھی ظاہر ہوگیا

تخلص : **شہیدی**

نام : **کرامت علی**

پیدائش : بالس بریلی

وفات : ۱۸۴۰ء (مدینہ)

کر چکے نیم نگہ پر مرے دل کا سودا
نہ خریدو، یہ ابھی اور بھی ارزاں ہوگا

رحم آتا ہے مجھے اِس نوجوانی پر تری
اے شہیدی! رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

سیکھ لے ہم سے کوئی ضبطِ جنوں کے انداز
برسوں پابند رہے، پر نہ ہلائی زنجیر

اے کاش! چُھٹیں عہد شکن بن کے جہاں میں
باز آئے، وفاداری کا دعوےٰ نہ کریں گے
عصمت کا انھیں خوف ہے تقویٰ کا ہمیں پاس
نے کی ہے کبھی خواہشِ بے جا، نہ کریں گے

تخلص : **شیفتہ**

نام : **نواب محمد مصطفےٰ خاں**

پیدائش : ۱۸۰۶ء (دہلی)

وفات : ۱۸۶۹ء (دہلی)

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ!
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ہم سے پوچھیں کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر
کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا

دامن تک اس کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا

یاس سے آنکھ جو جھپکی تو توقع پہ کھُلی
صبح تک وعدۂ یار نے سونے نہ دیا

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے، تو کیا نام نہ ہوگا

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے

اِک عمر ہو گئی انھیں ذکرِ جواب میں
پوچھی تھی ہم نے وجہِ ملاقاتِ مدّعی

یہ اہلِ مروّت ہیں تقاضا نہ کریں گے
بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر

جس لب کے غیر بوسے لے اس لب سے شیفتہ
کمبخت گالیاں بھی نہیں میرے واسطے

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اس کی بزم میں
آئے وہ اس طرح کہ مجھے پیار آگیا

کہتے ہیں تجھ کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گِلے تمام ہوئے اِک جواب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدّعا ہو کاش!
وہ خط ہی اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

اس نو بہارِ حُسن کو بدنام مت کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

تخلص : صابر دہلوی

نام : مرزا قادر بخش

پیدائش : ۱۸۰۸ء (دہلی)

وفات : ۱۸۴۷ء (بنارس)

پہلے نہ اُڑایا کسی بے کس کے جگر کو
پر ہم نے لگائے ہیں ترے تیر نظر کو

ہے تیزیِ نگہ بزم عدو میں مری جانب
غصّے میں چھپایا ہے محبت کی نظر کو

کیوں آتشِ گل باغ میں ہے تیز کہ ہم آپ
اُٹھ جائیں گے اے شبنمِ شاداب! سحر کو

دن رات کا فرق ان کی محبت میں ہے اب تو
وعدہ تو کیا شام کا اور آئے سحر کو

دل چیز ہے کیا جان بھی دوں عشق میں صابر
میں نفع سمجھتا ہوں مدام ایسے ضرر کو

تخلص : صبا

نام : **وزیر علی**

پیدائش : لکھنؤ

وفات : ۱۸۵۵ء (لکھنؤ)

دل میں اِک درد اُٹھا، آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیئے، کیا یاد آیا

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجیئے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں

حوروں کی طرف لاکھ ہو زاہد کی توجہ — کھُل جائینگی آنکھیں جو کبھو تو نظر آیا

حالِ دل کہیئے، تو کس طنز سے وہ کہتے ہیں
تم سلامت رہو الفت کے جتانے والے
کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانے غریب اگلے زمانے والے

تخلص : صنعتؔ مراد آبادی

نام : شیخ کریم الدین

پیدائش : مراد آباد

وفات : ۱۸۴۸ء (رامپور)

وصل کی شب میں بھی ہم باہم دگر رویا کئے
میں جدائی سے، وہ میرے حال پر رویا کئے

اس نے زانوِ غیر کا اپنے رکھا جب زیرِ سر
اپنے زانو پر ہم اپنا رکھ کے سر رویا کئے

اس نے آنسو غیر کے پونچھے جب اپنے ہاتھ سے
ہم نشیں! یہ ماجرا ہم دیکھ کر رویا کئے

ہو گیا شکل مری مژگاں سے مژگاں کا ملاپ
حائل اِک دریا ہوا، ہم اس قدر رویا کئے

سرخرو بے آبروئی میں بھی ہم صنعتؔ رہے
خشک جب آنسو ہوئے، لختِ جگر رویا کئے

تخلص : ضیاؔ

نام : ضیاء الدین

پیدائش : دہلی

وفات : ۱۷۷۳ء (عظیم آباد)

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

رازِ دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں
بات منہ پر آ رہی ہے، لب ہلانا ہے منع

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگِ خلق
اُس کے کوچے میں ضیاؔ! تو آج پھر جانے لگا

میں نے کل پوچھا ضیاؔ سے دل کدھر کو کھو دیا
اُس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ سے رو دیا

برس اے ابر! جتنا چاہے نواب تیری باری ہے
کبھی دل تھا تو میں رو رو کے اک دریا بہاتا تھا

تخلص : ظہیر دہلوی
نام : سیّد ظہیر الدین
پیدائش : دہلی
وفات : ۱۹۱۱ء (حیدر آباد)

کیا بُری شے ہے محبت بھی الٰہی توبہ
جُرمِ ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں

بس اسی مُنھ سے شکایت کرنے بیٹھے تھے ظہیر
خود پشیماں ہوگئے، اُس کو پشیماں دیکھ کر

تو کہاں آئی مرا درد بٹانے کے لئے
اے شبِ ہجر! نکل جا مرے غم خانے سے
کون ہوتا ہے مصیبت میں کسی کا دل سوز
اُٹھ گئی شمع بھی جل کر مرے کاشانے سے
کچھ یہی کوہ کن و قیس پہ گزری ہو گی
ملتی جلتی ہے کہانی مرے افسانے سے

تخلص : عزیز صفی پوری
نام : منشی ولایت علی خاں
پیدائش : ۱۸۴۱ء
وفات : صفی پور (اناؤ)

بُلا کے بات بھی کی اور مُسکرا بھی دیا
کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا بھی دیا

گیا جو نامہ بر، آیا بہت سراسیمہ
کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا بھی دیا

سنبھلتے حضرتِ موسیٰ مگر ستم یہ ہوا
دِکھا کے جلوۂ دیدار کچھ سُنا بھی دیا

میں وہ چراغ ہوں جس کو فروغِ ہستی نے
قریبِ صبح کیا روشن اور بُجھا بھی دیا

عزیز اس کے کرم پر فدا نہ ہوں کیونکر
کہ عشق دے کے مجھے عشق کا مزا بھی دیا

تخلص : **عیش**

نام : **آغا جان**

پیدائش : ۱۷۸۴ء (دہلی)

وفات : ۱۸۷۹ء (دہلی)

عشق اور مُشک چُھپائے سے کہیں چُھپتا ہے
دردِ دل لاکھ چُھپایا، پہ چھپایا نہ گیا

گردش ہے اس کی چشم کو، مستی میں کیا کہیں
نرگس کا پھول، تیر رہا ہے شراب میں

شغل کچھ چاہیئے بہلانے کی خاطر دل کے
گر نہیں وصل کی اُمّید، چلو یاس تو ہے

اے شمع ! صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے، اسے بھی گزار دے

ہستی کا حال اپنی بھلا تم سے کیا کہیں
دنیا میں آکے دیکھ گئے ایک خواب سا

تخلص : **فائز**

نام : **نواب صدرالدین محمد خاں**

(دکنی کے ہم عصر اس دہلوی اُستاد شاعر کا ابھی حال ہی میں پتہ چلا ہے۔ پیدائش اور وفات وغیرہ کی تاریخوں کا پتہ نہیں چل سکا)

تری گلی مجھ کوں پیاری لگے
دُعا میری تجھ من میں بھاری لگے

تری قدر عاشق کی بُوجھے سجن
کسی ساتھ اگر تجھ کوں یاری لگے

نہیں تجھ سا اور شوخ اے من ہرن
تری بات دِل کوں نیاری لگے

بھواں تیری شمشیر و زُلفاں کمند
پلک تیری جیسے کٹاری لگے

عشق تیرے نے سربلند کیا ‏ ‏ ‏ ‏ خاک سیتی سجن اُٹھا کے کیا

سورج کا جلانے کوں جگر جیوں دلِ فائز
اے نار! تو کیوں دھوپ میں سر کھولے کھڑی ہے

تخلص : فغاںؔ

نام : اشرف علی خاں

پیدائش : دہلی

وفات : ۱۷۷۲ء (عظیم آباد)

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر! کہیں

تیری گلی میں خاک بھی چھانی کہ دل ملے
ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں

اتنا وفورِ جوشش نہیں آتا ہے اشک کا
عالم کو مت ڈبوئیے اے چشمِ تر! کہیں

باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے
آنسو کہیں ڈھلک گئے، لختِ جگر کہیں

مجھ سے جو پوچھیے تو بہر حال شکر ہے
یوں بھی گزر گئی، مری یوں بھی گزر گئی

تخلص : **قائم چاند پوری**

نام : **محمد غیاث الدین**

پیدائش : ۱۷۲۲ء (چاند پور، ضلع بجنور)

وفات : ۱۷۹۳ء (رامپور)

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

غیر سے ملنا تمہارا سُن کے گو ہم چُپ رہے
پر سُنا ہو گا کہ تم کو اِک جہاں نے کیا کہا

سیکھے ہو کس سے سچ کہو پیارے یہ چال ڈھال
تم اک طرف چلو ہو تو تلوار اِک طرف
کس بات پر میں تیری کروں اعتبار ہائے
اقرار اِک طرف ہے تو انکار اِک طرف

بھول کر بھی وہ نہیں یاد سے جاتا اپنی
جان کر یاد سے جس نے کہ بھلایا مجھ کو

صبر و قرار و ہوش، دل و دیں تو واں رہے
اب تک تو آبرو سے نبھی ہے جہاں رہے
دنیا میں ہم رہے تو کئی دن، پر اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

ظالم تو میری سادہ دلی پہ تو رحم کر
رُوٹھا تھا آپ تجھ سے میں اور آپ من گیا

سچ کہو، قتل پہ کِس کے یہ کمر باندھی ہے
اِن دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت
قائم آتا ہے، مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار سے بیمار بہت

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

تخلص : گویاؔ

نام : نواب حسام الدّولہ طہور جنگ، فقیر محمد خاں

پیدائش : لکھنؤ

وفات : ۱۸۵۰ء

اس کو غفلت پیشہ کہہ آتے ہیں ہم
بھول جانا یاد دِلواتے ہیں ہم

ضعف سے رہتا ہے اب پاؤں پہ سر
آپ اپنی ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم

دل نہیں اس بُت کی اُلفت چھوڑتا
ناسمجھ کو لاکھ سمجھاتے ہیں ہم

ہے جنازہ اس لئے بھاری مرا
حسرتیں دل کی لئے جاتے ہیں ہم

بارِ عصیاں سر پہ ہے گویاؔ بہت
کیا اُٹھائیں سر، جُھکے جاتے ہیں ہم

تخلص : **مظہر**

نام : **مرزا شمس الدین جان جاناں**

پیدائش: ۱۷۰۰ء (کالا باغ، مالوہ)

وفات : ۱۷۸۰ء (دہلی)

جو تُو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اُس کو دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اِک شہر میں قاتل رہا ہے

تخلص : **ممنونؔ**

نام : **میر نظام الدین**

پیدائش : سونی پت

وفات : ۱۸۴۲ء (دہلی)

الٰہی وہ جو وعدے ہیں، وفا کس طرح ہووین گے
نہ واں خُو یاد آنے کی، نہ یاں شیوہ تقاضے کا

یہ نہ جانے تھے کہ اس محفل میں دل رہ جائے گا
ہم یہ سمجھے تھے چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

رات تھوڑی، حسرتیں دل میں بہت
صُلح کیجے، بس لڑائی ہو چکی

اس مرگ پہ سو جاں مری صدقے کہ دمِ نزع
گھبرا کے کہے تو کہ بس! اب دیکھیے کیا ہو

اپنا غُبار بھٹکے ہے مانندِ گردِ باد
گو ہو گئے ہیں خاک، پہ ہے جستجو ہنوز

تخلص : منیر شکوہ آبادی

نام : سیّد اسماعیل حسین

پیدائش: شکوہ آباد

وفات : ۱۸۸۱ء (رامپور)

کچھ جوانی ہے ابھی، کچھ ہے لڑکپن ان کا
دو دوغا بازوں کے پھندے میں ہے جوبن ان کا

فراقِ یار میں ہر طرح دن گزر جاتا
قضا جو رحم نہ کھاتی، تو کیا میں مر جاتا

آمد تصوّرِ بتِ بیداد گر کی ہے
دل کی بھی لوٹ خانہ خرابی جگر کی ہے
تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے
پھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہو گی اِس طرف
اُمید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے

تخلص : **نسیم دہلوی**

نام : **اصغر علی خاں**

پیدائش : ۱۷۹۹ء (دہلی)

وفات : ۱۸۶۶ء (دہلی)

نام میرا سنتے ہی شرما گئے　　تم نے تو خود آپ کو رُسوا کیا

محبت ہو کسی سے یا عداوت　　مزا دے جائے گی جو دل سے ہو گی

جب اور کسی پر کوئی بیداد کرو گے　　یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

آؤ آپس میں سمجھ لیں غیر کا ہے کو سُنے
تم کہو دل سے ہمارے کچھ تمہارے دل سے ہم

ترے چُھٹنے سے چھوڑا آنسوؤں نے ساتھ آنکھوں کا
گلے مِل مِل کے آپس میں چلے آتے ہیں دامن تک

گِلے میں بخت کے ان کا بھی کچھ قصّہ نکل آیا
ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

تخلص: **نصیر**

نام : **شاہ نصیرالدین**

پیدائش: دہلی

وفات: ۱۸۳۸ء (حیدرآباد)

نہا کے افشاں چُنو جبیں پر، نچوڑو زُلفوں کو بعد اس کے
دکھاؤ عاشق کو اس ہُنر سے، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

کعبے سے غرض اُس کو، نہ بُتخانے سے مطلب
عاشق جو ترا ہے، نہ اِدھر کا، نہ اُدھر کا

آہ! کچھ ہم کو نہ تھی، فرصتِ یکدم کی خبر
اے حبابِ لبِ جُو! تو نے یہ عقدہ کھولا

نصیر اس شوخ کی یہ کج ادائی کوئی جاتی ہے
مثل مشہور ہے، رسّی جلی لیکن نہ بل نکلا

خیالِ زُلف میں ہر دم نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر

تخلص : **نظاؔم رامپوری**

نام : **سیّد نظام شاہ**

پیدائش: ۱۸۲۲ء (رام پور)

وفات : ۱۸۷۲ء (رام پور)

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مُسکرا کے ہاتھ

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مِل گئیں
کیا مُنھ پہ اُس نے رکھ لئے آنکھیں چُرا کے ہاتھ

یہ بھی نیا ستم ہے، حِنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ

کُوچے سے تیرے اُٹھیں تو بھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اُٹھا کے ہاتھ

دینا وہ اُس کا ساغرِ مے یاد ہے نظاؔم
مُنھ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

عادت ہی تکلف سے ہوئی شرم و حیا کی
سوتے میں بھی منھ سے جو دوپٹہ نہیں اٹھتا

نہ وہ مانتے ہیں، نہ میں مانتا ہوں
سفارش کسی کی، دلاسا کسی کا

نہ ملنے پہ اس کے تو مرتے ہیں لاکھوں
جو ملتا تو کوئی بھی، جیتا نہ ہوتا

غیر کے دھوکے میں خط لے کے مرا قاصد سے
پڑھنے کو پڑھ تو لیا نام مگر چھوڑ دیا

یوں آپ تو کہوں گا نہ رنجش کا ماجرا
پوچھو گے تم تو مجھ سے چھپایا نہ جائے گا

یوں ہم کو نہ دل سے تم بھلاؤ
دیکھو کبھی یاد آئیں گے ہم

دمِ مرگ آئے وہ عیادت کو
کیا اجل سے میں شرمسار ہوا

نامہ بر کچھ تُو، زبانی بھی تو کہنا اُن سے
میرا مطلب ہے بہت، اور ہے تھوڑا کاغذ

وہ اشاروں میں اس کا کہنا ہائے
دیکھو اپنے پرائے بیٹھے ہیں

کر کے پرُزے دیئے نامے کے کہا قاصد سے
ایک خط کے عوض سینکڑوں لے جا کاغذ

آجائے کچھ نہ رحم مرے حالِ زار پر
اس واسطے وہ دیکھتے ہی اب اِدھر نہیں

انکار پہ ہی صبر، نہ اقرار پر یقیں
یارب! پڑی ہے جان مری کس عذاب میں

آپ کچھ سمجھے باتوں باتوں میں
حال کِس کا سُنا دیا میں نے

ہے کِس کا انتظار، کہاں دھیان ہے لگا
کیوں چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

تخلص : وحید

نام : بدرالدین

پیدائش : ۱۸۲۹ء (کڑہ، الہ آباد)

وفات : ۱۸۹۲ء

خیر اسی بات کی قسم کھاؤ آج سے کیا کبھی نہ بولو گے

آپ کے عشق نے دکھلا دیئے دونوں کے سلوک
اب گلہ کچھ ہے نہ اپنے سے نہ بیگانے سے

عشق کا نام لیا ہے تو ہو بہتر انجام
اب تو بدنام نہ ہونے میں بھی رُسوائی ہے

قیس نے صحرا لیا فرہاد نے کہسار کو بعد میرے سب علاقہ لُٹ گیا جاگیر کا

اے دل تجھے رونا ہے تو جی کھول کے رو لے
دنیا سے نہ بڑھ کر کوئی ویرانہ ملے گا

کس کی ہوائے شوق نے بھڑکائی دل کی آگ
جلتا ہوا چراغ ہوں میں کس کی راہ کا

تخلص : وزیرؔ لکھنوی

نام : خواجہ محمد وزیر

پیدائش : ۱۸۱۳ء (لکھنؤ)

وفات : ۱۸۵۳ء (لکھنؤ)

چلا ہے او دلِ راحت طلب! کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

کیا قتل اس نے غیروں کو مرے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

دیکھنا حسرتِ دیدار اسے کہتے ہیں
پھر گیا منھ تری جانب دمِ مُردن اپنا

تخلص : ہدایت

نام : ہدایت اللہ خاں

پیدائش : ۱۷۲۷ء (دہلی)

وفات : ۱۸۰۰ء (دہلی)

ناتوانی کا بھی احساں ہے میری گردن پر
کہ ترے پاؤں سے سر مجھ کو اٹھانے نہ دیا

بھلا بتا تو مری جان! کچھ ہدایت نے
تمہارے جور سے شکوہ کبھی کیا ہوگا
مگر یہی نا کہ بے اختیار ہو کے کبھی
کچھ اور بس نہ چلا ہوگا، رو دیا ہوگا

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا
نہیں بعد میرے کوئی بیکسی کا
کیا تیغِ قاتل نے جب کام اپنا
میں منھ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

تخلص: **یقینؔ**

نام : **نواب عنایت اللہ خاں**

پیدائش: ۱۷۲۸ء (دہلی)

وفات: ۱۷۵۵ء (دہلی)

بن چاک، سینے بیچ محبت کی جا نہیں
جس گھر کا در کھلا نہیں، اس میں ہوا نہیں
کعبے میں بھی گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

نزع میں دیکھ مجھے یار جھجھک کر بولا
کیا بری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار کہ بس
آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا
کیا خریدار نے پایا ہے خریدار کہ بس

گریباں چاک کرنے سے ہمارے تجھ کو کیا ناصح
ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیرہن جانے

مرزا مہدی حسن خاں آباد لکھنوی

جہاں تک ہو سکا اپنی زباں سے اس سے کہہ گزرے
جتائی بات ہم نے دوستی کی اپنے دشمن کو

منشی احسان علی احسان شاہجہانپوری

(۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۴ء)

اپنی گلی میں دیکھ کے ہم ہو رہے ہیں خوش
نقشِ اُمید، یار کا نقشِ قدم ہوا

خواجہ امین الدین امینؔ

(وفات ۱۸۴۲ء)

صبح گر صبحِ قیامت ہو تو کچھ پروا نہیں
ہجر کی جب رات ایسی بیقراری سے کٹی

سید شجاع الدین انور

کس سوچ میں ہیں آئینے کو آپ دیکھ کر
میری طرف تو دیکھیے، سرکار کیا ہوا

نہ ہم سمجھے، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

شیخ بقاء اللہ بقا

(پیدائش دہلی - وفات ۱۷۹۱ء)

کچھ تعیّن نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں
جس جگہ بیٹھ گئے، اپنی وہی منزل ہے

سنتوکھ رائے بیتاب

مدت سے انتظار میں اپنی کٹی ہے یاں   ابتک جو ہم نہ آئے الٰہی کہاں رہے

چشمِ بد دُور عجب خوش قد و قامت ہو گا
ابھی فتنہ ہے، کوئی دن میں قیامت ہو گا

مرزا نعیم بیگ جوؔان

یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رُکھائیاں ہیں
شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ سُجھائیاں ہیں
کس بے ادب نے تم سے گُلبازی آج کی ہے
منھ پر تمھارے چڑیں کیا سخت آئیاں ہیں

منشی جواہر سنگھ جوہؔر

خار کی طرح ملی باغِ جہاں میں تقدیر
جس سے لپٹوں وہ چُھڑا لیتا ہے دامن اپنا

مادھو رام جوہر

اب عطر بھی ملو تو محبت کی بو نہیں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

حاتم

اب ان کا سامنا ہوتا ہے تو منھ پھیر لیتے ہیں
کہاں کی رسمِ اُلفت چھوڑ دی صاحب سلامت بھی

حاذق

رُک رُک کے دیکھتے ہیں وہ اپنا خرامِ ناز
پھر پھر کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

میر محمد باقر حزیںؔ

ہر نصیحت میں تری مانوں گا اے ناصح! پر ایک
دِلبروں کے دیکھنے میں جی مِرا ناچار ہے

حال اے قاصد! مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ
اِس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محبوب ہو

میر محمد حیات حسرتؔ

عشق میں خواب کا خیال کسے
نہ لگی آنکھ، جب سے آنکھ لگی

خواجہ حسن حسنؔ

وقتِ نظّارہ نہ رو، کہتے تھے اے چشم تجھے
شدّتِ گریہ سے، لے خاک نہ سوجھا دیکھا

مرزا رحیم الدین حیاؔ

(۱۸۰۶ء تا ۱۸۸۶ء)

بُتوں کو چاہ کے ہم تو عذاب ہی میں رہے
شبِ فراق کٹی، روزِ انتظار آیا

نواب نصیر الدین حیدرؔ

سمایا ہے جب سے تُو نظروں میں میری
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے

میر دوست علی خلیلؔ

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا ہم کو
اُٹھیے، گھر جائیے، دم لے چکے، سُستائے بہت

مرزا داؤد اورنگ آبادی

پیدائش : اورنگ آبادی
وفات : ۱۷۵۳ء اورنگ آباد

حقیقت درد کی بیمار سے پُوچھ
مرا احوال چشمِ یار سے پُوچھ

اے زاہداں! اُٹھاؤ جبیں کو زمین سے
جو سر نوشت ہے اسے کاں تک مٹاؤ گے

رائے سرب سکھ دیوانہ

(وفات ۱۷۸۹ء شاہجہاں آباد)

جب نہ تب سُنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اُسے، پر نہیں انکار بغیر
دیکھ بیمار کو تیرے، یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کی شفا شربتِ دیدار بغیر

بندرا بن راقم

"مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہے ابرو"
یہ کہہ کے میں نے اس سے جب دل کی داد چاہی
کہنے لگا کہ "ترکش جس وقت ہووے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی"

شیخ امان علی سحر

اس کوچے میں بیٹھے تھے کہ بس مر کے اُٹھیں گے
اب لاش پڑی ہے وہیں، مُردہ نہیں اُٹھتا

چشمِ میگوں نے انھیں نادم کیا
محتسب دوڑے شرابی جان کر

راجہ نواب علی خاں سحر

(وفات: ۱۸۴۵ء)

وائے ناکامی تب آیا ساقیٔ پیماں شکن
جب ہماری عمر کا لبریز ساغر ہو گیا

سیّد فرزند احمد سفیر بلگرامی

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا — ہائے کچھ بات کر نہیں آتی

نظر ملا کے کہا مجھ سے میرے ساقی نے
حرام کہتے ہیں جس کو یہ وہ شراب نہیں

میر کلّو شاعر

کیا کیا اثر دیئے ہیں بتوں کی نگاہ کو
یارب عطا ہو کچھ تو ہماری بھی آہ کو

سعادت علی حسین خاں شرف لکھنوی

شاخِ گُل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

قریبِ مرگ ہوں لِلّٰلہ آئینہ رکھ دو
گلے سے میرے لپٹ جاؤ پھر نکھر لینا

رما کے دھونی جو بیٹھا ہوں مانگ پر اس کی
اسی لکیر کا مجھ کو فقیر ہونا تھا

طالب جے پوری

بیخودی میں ہم تو تیرا در سمجھ کے جھک گئے
اب خدا معلوم کعبہ تھا کہ وہ بُت خانہ تھا

وہ میرے بعد روتے ہیں اب ان سے کیا کوئی پوچھے
کہ پہلے کس لئے ناراض تھے، اب مہرباں کیوں ہو؟

طاہر علی طاہر فرخ آبادی

کہہ دیں گے صاف صاف وہ دیکھیں تو آئینہ
یہ مانگ ہے لکیر، ہم اس پر فقیر ہیں

محمد منوّر خاں غافل لکھنوی

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں!
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

حکیم ثناء اللہ خاں فراق

(۱۷۶۰ء تا ۱۸۳۰ء)

دل تھا منتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

میر شمس الدین فیض

(۱۷۸۰ء تا ۱۸۶۶ء)

ایک تیرے نہ ہونے سے مجھ پر سو طرح کا عذاب آتا ہے

مرزا عبد التقی بیگ مائل دہلوی

آج کہتی ہے شبِ غم کی سیاہی کچھ اور
آج مر جائیں جو ارمانِ سحر رکھتے ہیں
تم نے دیکھے ہی نہیں دردِ محبت والے
لاکھوں ایسے ہیں جو باتوں میں اثر رکھتے ہیں

محمد محسن محسن

دل مرا وابستۂ ہر تارِ زُلفِ یار ہے
ہے تو دیوانہ یہ پر اپنے کام میں ہُشیار ہے

مرزا غلام حیدر مجذوب

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں
بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
تم اپنی زُلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

جل گیا خشک ہو کے دامنِ دل اشک آنکھوں سے اور کیا بہتے
ہم کو جلدی نے موت کی مارا ورنہ جیتے تو اور غم سہتے

شیخ امیر بخش مسرور کاکوروی

کچھ ہوش ٹھکانے ہوں تو لیں نام کسی کا
ہم دے کے کہیں دل کی رقم بھول گئے ہیں

مرزا حسین علی بیگ محنتؔ

ناصح ! یہ نصیحت نہ سُنا، میں نہیں سُنتا
بک بک میں مرا مغز نہ کھا، میں نہیں سُنتا
احوال مرا دھیان سے سُنتا تھا، ولیکن
کچھ بات جو سمجھا، تو کہا، میں نہیں سُنتا

مرزا مہتاب بیگ منتہیؔ

عالم کا مرقع کیا مجمع ہے حسینوں کا
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

اسیر کر کے ہمیں حکم دے گیا صیّاد
قفس ہو تنگ تو ان کے نہ بال و پر رکھنا

راجہ رام نرائن موزوں

غزالاں! تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

میاں محمد امان نثار

ہم آگے ہی سمجھے تھے تم گھر کو سدھارو گے
جوں صبح گجر باجا، ماتھا وہیں ٹھنکا تھا
مینا میں نہ ہو جلوہ، وہ بادۂ گلگوں کا
جامے میں جو کچھ یارو! رنگ اس کے بدن کا تھا

سید فضلِ رسول خاں واسطی سندیلوی

ادا حق بندگی کا بھی کسی سے ہو نہیں سکتا
بڑے نافہم ہیں کرتے ہیں جو دعویٰ خدائی کا

نصرت

طبیبوں نے جو دیکھا نبض کو میری تو یہ بولے
یہ جاوے گا تمہارے جی کے ساتھ آزار دیکھو گے
نہ دو گے شربتِ دیدار گر بیمار کو اپنے
تو جی دے گا تمہارا طالبِ دیدار دیکھو گے

واصف

دفورِ بے خودی میں رکھ دیا سر ان کے قدموں پر
نہ کہتے ہی رہے واصف یہ محفل ہے یہ محفل ہے

شاہ واقف دہلوی

سب سے ملتے تو ہو ظاہر ہیں یہ دھڑکا ہے مجھے
کہیں مجھ سا نہ کوئی اور گرفتار ملے

نول رائے وفا

کل دل کو لیا، مکر گئے آج		بس آپ کا اعتبار دیکھا

بیچے ہے اِک نگاہ پہ دل کتے نہیں وفا
لینا ہو گر تمہیں تو یہ کچھ اتنا گراں نہیں

نواب نیاز احمد خاں ہوش

(وفات : ۱۸۹۲ء)

زیست میں کیا پوچھتے ہو ہم سے حالِ بعدِ مرگ
خواب سے پہلے بیاں کیا خواب کی تعبیر ہو

مصطفےٰ قلی خاں یکرنگ

کیا جانیئے کہ وصل ترا کس کو ہو نصیب
ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

شاعرات :

نواب اختر محل اختر

لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا　　اُن کا تھا کھیل، خاک میں ہم کو مِلا دیا

بیگم (میر تقی میر کی بیٹی)

برسوں خمِ گیسو میں گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم نے مجھے مار تو رکھا
کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی
ہاں یار کے رُخسار پہ رُخسار تو رکھا

نواب بیگم حجاب

(نواب واجد علی شاہ کی بیگم)

کچھ خوفِ خدا کیجیے اس طرح نہ چلیے
سو بار تو اِس چال پہ تلوار چلی ہے

گنا بیگم شوخ

(نواب امداالملک غازی الدین کی بیٹی)

ظاہر میں تو ملنے کی [illegible] نہیں ہے
اب خواب میں ہی وصل ترا ہووے تو ہووے

سکندر جہاں بیگم ضیا

جی میں تو فکرِ بتاں اور لب پہ ہو ذکرِ خدا
اے دلِ بے تاب! تجھ سے پارسائی ہو چکی

ضیائی بیگم ضیا

میں ہوں وہ ننگِ خلق کہ کہتی ہے مجھ کو خاک
اس کو بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

زیب النسار مخفی

(بادشاہ اورنگ زیب کی بیٹی)

آکر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے
خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

چنبیلی یاسمن (سید انشا کی کنیز)

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اُردو کے انگریز شعرا:

(اُردو کے انگریز شعرا کی تخلیقات اگرچہ ادبی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں، بلکہ ان کا بیشتر کلام اُردو کے اُستاد شعرا کے کلام کی آوازِ بازگشت ہی معلوم ہوتا ہے تاہم ان کی تخلیقات اس حقیقت کا بیّن ثبوت پیش کرتی ہیں کہ اردو زبان کی لطافت اور مقبولیت کا جادو ان کے بھی سر چڑھ کر بولا۔ تنوع کے لحاظ سے اردو کے کچھ انگریز شاعروں کے کچھ شعر مندرجہ ذیل ہیں۔)

الیگزینڈر ہیڈرلی آزاد (۱۸۲۹ء - ۱۸۶۱ء)

میری صورت سب کہے دیتی ہے میرا رازِ دل
میرے تیور دیکھ کے وہ مجھ سے بدظن ہو گیا

رابرٹ گارڈنر اشبق

جب کہا میں نے قسم کھاؤ تو بولے ہنس کے وہ
گر قسم ہے چیز کھانے کی تو کھالی جائے گی

بلتحظر اسیر

شمع فانوس میں در پردہ جلی ہے دیکھو　　شعلۂ آہ نکلا ہے جگر سے باہر

ہم اس آئینہ رُو کے ہجر میں یوں زیست بسر کرتے ہیں
کہ سکتے کی سی حالت ہے، نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں

جوزف بروبیٹ ولیم

بُت بنے بیٹھے ہیں کچھ کہتے نہیں سنتے ہیں سب
یہ نہیں کھلتا، زباں ان کے دہن میں کیوں نہیں

جارج فانٹم شایق

جورِ رقیب و منتِ درباں و طنزِ غیر
کیا کیا جفائیں ہم نے ترے واسطے سہیں

ڈانیال گارڈنر شکر

ہوا گردش سے ثابت بعدِ تحقیق
زمیں کہتے ہیں جس کو، آسماں ہے

جارج برنس شور

غیر کے ساتھ عیادت کو وہ دلبر آیا
لو مسیحا ملک الموت کو لے کر آیا

جان تھامس طوماس

سودا ہے زُلفِ یوسفِ ثانی کا اِس قدر
روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار زار زار

جوزف عاشق

آنکھ تک آیا نہیں دل میں کہاں سے پہنچا
کیا تصوّر نے نکالی ہے ترے راہ نئی

ڈی کاسٹا

مانگتے تم سے دُعا ہم نہ کبھی اے پیارے
مرضِ عشق کا جُز وصل جو چارہ ہوتا

وی۔ ڈی۔ مانروز مضطر

ستارے جن کو کہتے ہیں، اُٹھا لایا فلک اُن کو
گرے تھے پھول جو میرے چراغِ داغِ روشن سے

۱۔ رابرٹ گارڈنر اسبق ۷۔ جوزف عاشق
۲۔ التحفظ اسیر ۸۔ جارج فانٹم شائق
۳۔ جوزف بیوٹ ڈکیم ۹۔ ڈانیال گارڈنر شکر
۴۔ الیگزینڈر آزاد ۱۰۔ ڈی کاشا
۵۔ جان تھامس طرماں ۱۱۔ جارج برنس شور
۶۔ ڈی۔ ڈی۔ ماٹرڈز مضطر

شعر و شاعری

گلکاریاں	فراق گورکھپوری	1/-
بہترین رباعیاں اور قطعے	مرتبہ:- پرکاش پنڈت	1/-
پاکستان کی اردو شاعری	"	1/-
۱۹۶۶ء کی منتخب شاعری	"	1/-
اردو کی بہترین رومانی نظمیں	"	1/50
اردو شاعری کی رنگینیاں	"	2/-
میخانہ	"	2/-
حسن و عشق	"	2/-

ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ

جی - ٹی - روڈ ، شاہدرہ ، دہلی ۳۲